قیادت نامہ

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسائلِ ملّت

فرد ملت کے مسائل کا جو حل ہے، وہی خود ملت کے مسائل کا حل بھی ہے۔ ملت کا ایک فرد اپنی ذاتی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح مجموعہ افراد جس کا نام ملت ہے، اس کے مسائل بھی اس کی اپنی کوششوں سے حل ہوں گے۔ کوئی دوسرا اس کے مسائل کو حل کرنے والا نہیں۔

اس دنیا میں ایک بھائی کبھی دوسرے بھائی کے لئے نہیں کماتا۔ کوئی رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کے لئے لڑائی نہیں لڑتا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے۔ اس لئے ہر شخص پہلی فرصت میں " اپنی تعمیر آپ" کے اصول پر اپنی زندگی کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ ملّت کا سوال سامنے آتے ہی تمام لوگ بالکل دوسرے انداز سے سوچنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملت کے مسائل کا تعلق خود ملت سے نہیں بلکہ دوسروں سے ہے۔ اس کا تعلق حکومت سے ہے، انتظامیہ سے ہے، فلاں فلاں متعصب جماعتوں اور گروہوں سے ہے۔ وغیرہ۔

کوئی کہتا ہے کہ ملّی مسئلہ کے ذمہ دار فلاں فلاں سرکاری افسر ہیں، اس لئے ان افسروں کو معطل کراؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ حکمراں پارٹی اس کی ذمہ دار ہے، اس لئے الکشن میں اس پارٹی کے امیدواروں کے خلاف ووٹ دے کر انھیں شکست دو۔ کوئی کہتا ہے کہ متعصب جماعتیں اس کی ذمہ دار ہیں، اس لئے اخبار نکال کر ان کے خلاف دھواں دھار مضامین شائع کرو۔

یہ باتیں مضحکہ خیز حد تک غلط ہیں۔ اور اس غلطی کے سب سے بڑے ذمہ دار مسلمانوں کے نام نہاد رہنما ہیں۔ یہ رہنما اپنے ذاتی مسائل کو تو ہمیشہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ اور ملی مسائل کے بارے میں پر جوش تقریریں کر کے پوری قوم کا مزاج بگاڑ رہے ہیں۔ وہ ملت کے اندر تعمیر کے بجائے احتجاج کا ذہن بنا رہے ہیں۔

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ملت کے افراد کو باشعور بنایا جائے۔ ان کے اندر اخلاقی اوصاف پیدا کئے جائیں۔ دوسروں کے خلاف بیان دینے اور تقریر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

داخلی احتساب

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

(المائدہ ۷۹-۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی، داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے خارجی احتساب کو زندگی کی علامت سمجھ لیا ہے۔ مگر مذکورہ آیت اس کے برعکس یہ اعلان کر رہی ہے کہ داخلی احتساب مسلمانوں کی ایمانی زندگی کی علامت ہے۔ مسلم معاشرہ کے اندر برائی کو برداشت نہ کرنا اور آپس میں ایک دوسرے کو غلط کام سے روکنا اسلام اور ایمان کی لازمی شرط ہے۔ اہلِ ایمان کے معاشرے میں اگر یہ صفت باقی نہ رہے تو ایسے لوگ اللہ کی نظر میں لعنت زدہ قرار پائیں گے، جیسا کہ یہود کے ساتھ ہوا۔ دوسروں کے خلاف احتجاج اور احتساب کی کوئی بھی مقدار اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بنی اسرائیل (یہود) کی مذکورہ روش سے ڈرایا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم بھی خدا کی نظر میں اسی طرح ملعون ہو جاؤ گے جس طرح یہود خدا کی نظر میں ملعون قرار پائے۔ یہاں ہم چند حدیثیں نقل کرتے ہیں:

عن عبد اللہ بن مسعود قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرجل من بنی اسرائیل کان اذا رأى اخاہ على الذنب نهاہ عنہ تعذیرا فاذا کان من الغد لم یمنعہ ما رأى منہ ان یکون اکیلہ وخلیطہ وشریکہ فلما رأى اللہ ذالك منهم ضرب قلوب بعضهم على بعض ولعنهم على لسان نبیهم داؤد وعیسى ابن مریم ذالك بما عصوا وکانوا یعتدون ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر ولتاخذن على

يد المسيء ولتأطرنه على الحق أطرا اوليضربن الله قلوب بعضكم على بعض اوليلعنكم كما لعنهم۔

عن حذيفة بن اليمان ان النبي صلى الله عليه وسلم قال والذي نفسي بيده لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر اوليوشكن الله ان يبعث عليكم عقابا من عنده ثم لتدعنه فلا يستجيب لكم۔

عن عدي بن عميرة رضي الله عنه قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول انّ الله لا يعذب العامة بعمل الخاصة حتى يروا المنكر بين ظهرانيهم وهم قادرون على ان ينكروه فلا ينكرونه فاذا فعلوا ذالك عذب الله الخاصة والعامة۔ (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ ان کا ایک آدمی جب اپنے بھائی کو برائی کرتے ہوئے دیکھتا تو وہ پہلی بار اس کو منع کرتا۔ مگر جب اگلا دن آتا تو جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ اُس کو اِس سے نہ روکتا کہ وہ اس کے ساتھ کھائے اور اس کے ساتھ اٹھے بیٹھے۔ پس جب اللہ نے ان کے اندر یہ بات دیکھی تو ان کے دلوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیا۔ اور اپنے پیغمبر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی، ایسا اس لیے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جانے والے لوگ تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم کو ضرور ایسا کرنا ہوگا کہ تم (اپنے لوگوں کو) اچھائی کا حکم دو اور ان کو برائی سے روکو اور غلط کار کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کو حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دے گا یا تم پر لعنت کرے گا جس طرح اس نے یہود پر لعنت کی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ضرور (اپنے لوگوں کو) اچھائی کا حکم دوگے اور ضرور برائی سے روکوگے۔ ورنہ قریب ہے کہ اللہ تمہارے اوپر اپنے پاس سے عذاب بھیج دے۔ پھر تم اللہ کو پکارو مگر وہ تمہاری پکار کو نہ سنے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ بعض لوگوں کے عمل کی سزا عام لوگوں کو نہیں دیتا یہاں تک کہ ان کا یہ حال ہو جائے کہ وہ برائی کو اپنے (لوگوں کے) درمیان دیکھیں اور وہ اس کا انکار کرنے پر قادر ہوں پھر بھی وہ اس کا انکار نہ کریں۔ پس جب وہ ایسا کرتے ہیں تو

اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مذکورہ آیت اور مذکورہ احادیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے بارہ میں بھی خدا کا عین وہی قانون ہے جو اس سے پہلے یہود کے بارے میں تھا۔ اس اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو موجودہ فسادات وہی خدائی حکم نظر آنے لگتے ہیں جن کی پیشگی خبر حدیث میں دیدی گئی تھی۔ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے لعنت کی کوئی صورت نہ ہو۔ لعنت کے معنی ہیں خیر سے بعید کر دینا۔ موجودہ مسلمان شاید خدا کی رحمت سے دور کر دیئے گیے ہیں۔ وہ ہر صبح وشام اپنے "دشمنوں" کی بربادی کی دعائیں کرتے ہیں مگر ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ ان کے کچھ شرانگیز عناصر فساد کرتے ہیں اور اس کے بعد پوری قوم کو اس کی بدترین سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ تمام علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ موجودہ مسلمانوں پر شاید وہ کچھ نازل ہو چکا ہے جس کے نازل ہونے کا اندیشہ ان کے پیغمبر نے ظاہر کیا تھا۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بے قیدی اور بے راہ روی عام ہو گئی ہے۔ وہ بات بات پر لڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ چنانچہ تمام فرقہ وارانہ فسادات خود مسلمانوں کے بعض عناصر کی شرانگیز کارروائیوں سے شروع ہوتے ہیں۔ پھر جب فساد بڑھتا ہے تو پوری قوم کو اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ صورت حال بار بار پیش آرہی ہے اور تمام مسلمان اس کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں کوئی بھی قابل ذکر گروہ نہیں جو اپنے ان مجرموں کو کنڈم کرے اور ان کا ہاتھ پکڑنے کے لیے کھڑا ہو۔

مسلمانوں میں ایسے قائدین تو بہت ہیں جو حکومت (یا غیر مسلم فرقہ) کے خلاف تقریر اور بیانات کی دھوم مچانے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ حتی کہ ان میں ایسے مجاہدین بھی ہیں جو زمانہ کی کلائی موڑنے اور ساری کائنات کا احتساب کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ مگر ان کے درمیان کوئی بھی ایسا قائد نہیں جو مسلمانوں کے اوپر محتسب بن کر کھڑا ہو۔ جو ان مسلمانوں کے خلاف دھوم مچائے جو برادران وطن کے ساتھ اشتعال انگیز کارروائیاں کرتے ہیں اور ان کی انا کو بھڑکا کر پوری قوم کو آگ اور خون میں نہلانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

مذکورہ احادیث کے مطابق ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر داخلی احتساب کا نظام قائم ہو۔ ہر جگہ کے مسلمان اپنے ان افراد کی نگرانی کریں جو ابتدائی شرانگیزی کرکے فساد کی آگ بھڑکانے کا سبب بنتے ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ قائدین اپنی ساری طاقت حکومت (یا ہندو فرقہ) کے خلاف ایجی ٹیشن میں لگائے ہوئے ہیں۔ اس کے بجائے انھیں یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنی ساری طاقت خود مسلم افراد کی روک تھام پر لگادیں۔ یہی کرنے کا اصل کام ہے مسلمان اس کے سوا جو کچھ بھی کریں گے وہ صرف خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہوگا۔ وہ کسی درجہ میں بھی مسئلہ کو حل کرنے والا نہیں بن سکتا۔

قومی شریعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کے زمانہ کی بابت بہت سی پیشین گوئیاں کی تھیں جو حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان کا ایک مجموعہ وہ ہے جن میں یہ پیشگی خبر دی گئی ہے کہ مسلمان بعد کے زمانہ میں ان طریقوں پر چلیں گے جو یہود و نصاریٰ کے طریقے ہیں۔ یعنی وہ اپنی زبان سے اسلام کا نام لیں گے مگر عملاً ان کی روش وہ ہوگی جو یہود و نصاریٰ کی روش ہے۔ اس سلسلہ کی ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے:

عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رسولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قَالَ: لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُم شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰی لَوْ دَخَلُوا جُحْرَ ضَبٍّ لَتَبِعْتُمُوْہُمْ۔ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلْیَہُوْدُ وَالنَّصَارٰی۔ قَالَ فَمَنْ۔

(اخرجہ البخاری ومسلم)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ ضرور پچھلی امتوں کے پیچھے چلوگے، بالشت بالشت اور ہاتھ ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہوں تب بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ ہم نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اور کون۔

قرآن میں یہود کی بہت سی "سنتیں" بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک سنت وہ ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ میں آیا ہے۔ متعلقہ آیات کا ترجمہ یہ ہے:

اور جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا کہ تم اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے۔ اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالوگے۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو۔ اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو، ان کے مقابلہ میں ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ۔ پھر اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر ان کو چھڑاتے ہو۔ حالاں کہ خود ان کا نکالنا تمہارے اوپر حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا

ہے کہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن ان کو سخت عذاب میں ڈال دیا جائے۔ اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔ پس نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد پہونچے گی (البقرہ ۸۴ - ۸۶)

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ قدیم مدینہ میں دو مشرک قبیلے آباد تھے۔ ایک کا نام اَوس اور دوسرے کا نام خزرج تھا۔ دوسری طرف مدینہ اور اطراف مدینہ میں تین یہودی قبیلے تھے۔ بنو قینقاع بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ اَوس اور خزرج کا حال یہ تھا کہ ان کے درمیان اکثر جنگ جاری رہتی تھی۔ گویا قدیم مدینہ میں دو مشرکانہ محاذ قائم تھے۔ ایک اَوس کا محاذ، اور دوسرا خزرج کا محاذ۔ یہودی قبائل ان سے الگ نہ رہ سکے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر قبیلۂ خزرج کے محاذ میں شامل ہوگیے۔ اور بنو قریظہ قبیلۂ اَوس کے محاذ میں، ٹھیک ویسے ہی جیسے موجودہ زمانہ میں ایک مسلم ملک روس کے کیمپ میں شامل ہو جاتا ہے اور دوسرا مسلم ملک امریکہ کے کیمپ میں۔ یا جیسے ہندستان میں کچھ مسلمان کانگریس کے ساتھ مل جاتے ہیں اور کچھ مسلمان اپوزیشن کے ساتھ۔ اور پھر یہ مسلمان دو محاذوں میں بٹ کر آپس میں لڑتے ہیں۔

مدینہ کے ایک مشرک محاذ اور دوسرے مشرک محاذ کے درمیان جب جنگ چھڑتی تو یہودی قبائل کے لوگ بھی دونوں طرف سے شامل ہو جاتے۔ اس طرح ایک یہودی قبیلہ دوسرے یہودی قبیلہ کے خلاف جنگ کرتا۔ ایک یہودی دوسرے یہودی کو مارتا اور اس کو اس کی آبادی سے نکال کر جلاوطن کرتا۔ یہ فعل یہودی شریعت کے سراسر خلاف تھا۔ کیوں کہ ان کو ان کے پیغمبروں کے ذریعہ جو احکام دیئے گیے ان میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ ایک یہودی پر لازم ہے کہ وہ دوسرے یہودی کے جان و مال کا احترام کرے۔ ایک یہودی دوسرے یہودی پر کوئی ظلم نہ کرے۔

آپس کی لڑائی میں یہود اپنی شریعت کے احکام کو بھول جاتے۔ مگر جب جنگ ختم ہو جاتی اور وہ دیکھتے کہ یہودیوں کی ایک تعداد گرفتار ہو کر مشرک قبائل (اوس یا خزرج) کے قبضہ میں چلی گئی ہے اور وہ ان کو قیدی بنائے ہوئے ہیں تو اس وقت ان کی غیرت قومی جاگ اٹھتی۔ اس وقت وہ اپنی شریعت کا یہ حکم لوگوں کو سنانا شروع کرتے کہ "کوئی یہودی اگر غیر یہودی کے ہاتھ گرفتار ہو جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑاؤ" اب تقریریں ہوتیں۔ قومی چندے جمع کیے جاتے۔

یہودی قیدیوں کو مشرک قبائل سے فدیہ دے کر چھڑایا جاتا۔ اور پھر وہ فخر کے ساتھ اعلان کرتے کہ ہم نے موسوی شریعت کے فلاں حکم کے تحت ایسا کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول، صفحہ ۲۱-۱۲۰)

ان کے اس تضاد پر قرآن میں کہا گیا کہ تمہاری شریعت میں دو باتوں کا حکم تھا۔ ایک یہ کہ ایک یہودی دوسرے یہودی کو نہ مارے اور اس کو اس کے گھر سے نہ نکالے۔ تم نے بہت بڑے پیمانہ پر یہ جرم کیا اور اس وقت تم کو اپنی شریعت کا حکم یاد نہ آیا۔ تمہاری شریعت میں دوسرا حکم یہ تھا کہ یہودی غیر یہودی کے قبضہ میں چلا جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑاؤ۔ اس دوسرے حکم پر تم عمل کر رہے ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمہارا عمل حقیقۃً قومی جذبہ کے تحت ہے نہ کہ دینی جذبہ کے تحت۔ اگر اس کا محرک دینی جذبہ ہوتا تو تم دونوں جگہ دینی احکام پر عمل کرتے۔ مگر جہاں مسئلہ خالص دینی تھا وہاں تم کو دین یاد نہ آیا اور جب مسئلہ قومی غیرت کا بن گیا تو تم کو دینی حکم یاد آرہا ہے۔ ایسا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں۔ کیوں کہ اللہ کے یہاں اندرونی جذبہ کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے نہ کہ عمل کی ظاہری صورت کی بنیاد پر۔

اس بات کو لفظ بدل کر اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ معاملہ جب اپنی قوم کے دو افراد کے درمیان ہو تو چپ رہنا، اور جب معاملہ اپنی قوم اور غیر قوم کا بن جائے تو ہنگامہ کرنا اور خطرہ کی نفسیات جگا کر پُرشور تحریکیں چلانا، اس کا نام یہودی سنت یا یہودی روش ہے۔ یہودی آپس میں ایک دوسرے سے معاملہ کرتے ہوئے شریعتِ خداوندی کو پامال کرتے تھے، مگر ان کے رہنما اس کے خلاف کوئی جوش نہ دکھاتے۔ یہ انھیں تحفظ شریعت کا مسئلہ نظر نہ آتا۔ مگر جب یہودی کے اوپر غیر یہودی کوئی ظلم کرتا تو فوراً انھیں شریعت خطرہ میں نظر آنے لگتی۔ وہ اس کے خلاف دھواں دار تحریکیں چلاتے اور اپنی اس مہم کے حق میں شریعت الٰہی کے دلائل پیش کرتے۔

بدقسمتی سے یہود کی یہ سنت آج مسلمانوں میں پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ آپس کی بے دینی اور ناانصافی کو دیکھتے ہیں مگر اس معاملہ میں وہ بالکل بے حس بنے رہتے ہیں۔ ان کی اسی بے حسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ ان کے اندر داخلی ناانصافیوں پر کوئی بڑی تحریک اٹھائی جاسکے۔ البتہ غیروں کی ناانصافی کے معاملہ میں وہ انتہائی حساس ہیں۔ چنانچہ ایسے کسی معاملہ کو لے کر صبح و شام میں ان کے درمیان ایک دھواں دار تحریک اٹھائی جاسکتی ہے۔

ہمارے جو رہنما فخر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں مسئلہ پر لاکھوں مسلمانوں کا مجمع اکٹھا کر لیا وہ بھول جاتے ہیں کہ جس مسئلہ پر انھوں نے لاکھوں مسلمانوں کی بھیڑ جمع کی ہے وہ غیر قوم کی ناانصافی کا مسئلہ تھا۔ یہی رہنما اگر داخلی ناانصافی کے مسائل پر مسلمانوں کو پکاریں تو مجھے یقین ہے کہ انھیں ایسے پُرفخر کلمات بولنے کی خوش قسمتی حاصل نہ ہو سکے گی۔ غیر قوم کی ناانصافی کے عنوان پر اگر وہ بھرے ہوئے پنڈال میں بولنے کا موقع پا رہے ہیں تو داخلی ناانصافیوں کے نام پر کیے جانے والے جلسہ میں انھیں رہنماؤں کو یقینی طور پر خالی پنڈال میں خطاب کرنا پڑے گا۔

پچھلے پچاس برس کے اندر (مسلم لیگ سے لے کر مسلم پرسنل لا بورڈ تک) بہت سی بڑی بڑی تحریکیں مسلمانوں نے اٹھائی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے اٹھائے ہوئے گرد و غبار کے نتیجہ میں کبھی کبھی "زمیں شش شد و آسماں ہشت شد" کا منظر پیدا ہو گیا ہے۔ مگر یہ تمام تحریکیں وہ ہیں جو غیروں کی ناانصافی کے نام پر اٹھائی گئیں۔ ان میں سے کوئی ایک تحریک بھی ایسی نہیں جو مسلمانوں کی داخلی ناانصافی کے نام پر اٹھائی گئی ہو۔ حالاں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ غیر اقوام مسلمانوں کے اوپر جو ظلم کر رہی ہیں اس سے بہت زیادہ بڑا ظلم وہ ہے جو مسلمان خود اپنے ہم قوموں پر ہر روز کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

ایک اسلامی ادارہ نے ایک شہر میں عمارت خریدی اور وہاں اپنی شاخ قائم کی۔ اس شاخ میں ایک مسلمان کو مقامی انچارج بنایا گیا۔ اس مسلمان نے امانت میں خیانت کی۔ اس نے خفیہ طریقہ پر ایک بوگس رجسٹری کرائی اور اس بوگس رجسٹری کے ذریعہ اس عمارت کو اپنے نام کرا لیا۔ یہ واضح طور پر غصب اور بددیانتی کا معاملہ تھا۔ اس کا علم مسلمانوں کو اور مسلم رہنماؤں کو ہوا۔ مگر ان میں سے کوئی شخص نہ تھا جو اس معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت سمجھے۔

اس طرح کے معاملات آج ہر بستی اور ہر شہر میں پیش آ رہے ہیں۔ ایک مسلمان موقع پا کر دوسرے مسلمان کی چیز پر قبضہ کر لیتا ہے۔ مگر مسلم عوام اور مسلم رہنماؤں میں کوئی نہیں جو ان معاملات کو لے کر اٹھے۔ وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک حق دار کو اس کا حق نہ دلا لے۔ دوسری طرف انھیں عوام اور رہنماؤں کا یہ حال ہے کہ اگر انھیں اس کی اطلاع ملے کہ مسلم قوم کی عمارت پر غیر مسلم قوم کے کسی شخص نے قبضہ کر لیا ہے تو وہ فوراً اس کے خلاف متحرک ہو جاتے ہیں۔ وہ بستر مرض

سے اٹھ کر اس کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ مسلمان اور غیر مسلمان کا معاملہ ہو تو شریعت پر آنچ آنا انھیں گوارا نہیں۔ لیکن اگر معاملہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو تو انہیں کوئی بے چینی نہیں ہوتی، خواہ شریعت کے اعتبار سے وہ کتنا ہی زیادہ غلط کیوں نہ ہو۔

یہ عین وہی روش ہے جس کا الزام قرآن میں یہودیوں کو دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کی تصدیق ہے۔ مسلمانوں کا مسلم — مسلم مسئلہ میں چپ رہنا، اور مسلم — غیر مسلم مسئلہ میں "احتجاج اور شکایت" کی مہم چلانا بلاشبہ یہودی سنت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اصولی دینداری کے مقام سے گر کر قومی دینداری کے مقام پر پہونچ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک جگہ متحرک ہوتے ہیں اور دوسری جگہ متحرک نہیں ہوتے۔ اگر ان کا اسلام اصولی اسلام ہوتا تو وہ دونوں جگہ یکساں طور پر متحرک ہوتے، نہ کہ صرف اس جگہ جہاں معاملہ قومی نوعیت اختیار کرلے۔

آج ہمارے عوام اور خواص دونوں یکساں طور پر اس یہودی سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ غیر مسلم ناانصافی پر مہم چلانا اس وقت تک اللہ کی نظر میں بے قیمت ہے جب تک وہ مسلمان ناانصافی پر بھی اسی قسم کی مہم نہ چلائیں۔ کیوں کہ اللہ کے نزدیک مسلمان کے اوپر مسلمان کا ظلم بھی اتنا ہی برا ہے جتنا کہ مسلمان کے اوپر غیر مسلمان کا ظلم۔ اس قسم کی روش ان کی قومی شریعت میں خواہ کتنی ہی زیادہ اہم ہو، مگر الٰہی شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

ایک ہی سبب

۱۶ مئی ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے۔ بھیونڈی کے مسلمانوں نے اسلامی عظمت کے اظہار کے لیے شہر میں سبز جھنڈے لہرانے کا پروگرام بنایا۔ جھنڈے کے پرجوش مجاہدین اپنی اس مہم کے دوران ایک ایسے مقام پر پہونچے جو روایتی طور پر شیوسینا کی جگہ سمجھی جاتی تھی۔ مسلمان اس پر چڑھ گیے اور انھوں نے وہاں اپنا جھنڈا لہرا دیا۔

اس پر مسلمانوں میں اور شیوسینا کے کارکنوں میں تکرار ہوئی۔ یہ تکرار بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۷ مئی کو بھیونڈی میں فساد پھوٹ پڑا۔ اس فساد میں بھیونڈی اور اطراف کے علاقوں میں بڑے پیمانہ پر لوگ قتل ہوئے اور لوٹ اور آتش زنی میں تقریباً ایک ارب روپیہ کا نقصان ہوا۔ اس نقصان کا بیشتر حصہ قدرتی طور پر مسلمانوں کو ملا۔

اس واقعہ کے تین سال بعد ۲۶ اگست ۱۹۸۷ کو ٹھیک اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہوتا ہے۔ اس دوسرے واقعہ کا مرکز کراچی ہے۔ کراچی میں اس وقت مسلمانوں کی دو تنظیمیں سرگرم ہیں۔ ایک کا نام ہے پنجابی پٹھان اتحاد (پی پی آئی) اور دوسری کا نام ہے مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) مذکورہ تاریخ کو پی پی آئی نے اپنے جھنڈے کا مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس دوران اس کے پرجوش کارکنوں نے ایک ایسی عمارت کے اوپر اپنا جھنڈا گاڑ دیا جو ایم کیو ایم کے خیال کے مطابق اس کے گروہ کی تھی۔

ایم کیو ایم نے جھنڈا نصب کرنے کی اس کارروائی پر اعتراض کیا۔ اس پر دونوں فریقوں میں تکرار ہو گئی جو بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی اور دونوں طرف سے آٹومیٹک رائفلیں اور ریوالور چلنے لگے۔ کراچی سے گزر کر یہ فساد حیدر آباد (سندھ) تک پہونچا۔ اس جنگ میں دونوں مقامات پر کئی درجن آدمی مارے گیے۔ کثیر تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ سیکڑوں دکان اور مکان اور سواریاں جزئی یا کلی طور پر جلا دی گئیں (ہندستان ٹائمس ۲۷ اگست ۱۹۸۷، ٹائمس آف انڈیا ۲۹ اگست ۱۹۸۷)

یہ دونوں واقعات بالکل ایک قسم کے واقعات ہیں۔ اس لیے جب ہم ان کا سبب جاننا

چاہیں تو ہمیں ان کی توجیہہ کے لیے ایک ہی مشترک سبب تلاش کرنا ہوگا جو دونوں واقعات پر یکساں طور پر چسپاں ہوتا ہو۔ اگر ہم یہ کہیں کہ بھیونڈی کا فساد "ہندو شر پسندوں" نے کیا تو کراچی کے ٹھیک اسی قسم کے فساد کے لیے یہ الفاظ ناکافی ہوں گے۔ کیوں کہ کراچی میں "ہندو شر پسند" عنصر سِرے سے موجود ہی نہ تھا۔ ایسی توجیہہ جو ایک واقعہ پر چسپاں ہو اور دوسرے واقعہ پر چسپاں نہ ہو سکے، کسی متعصب اور جانبدار ذہن کو تو اپیل کر سکتی ہے۔ مگر وہ سنجیدہ اور حقیقت پسند انسانوں کو اپیل نہیں کر سکتی۔

جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں تو ہم کو ایک ہی مشترک توجیہہ ملتی ہے جو دونوں واقعات پر یکساں طور پر چسپاں ہوتی ہو۔ اور وہ توجیہہ ہے —— انسان کی انا کو چھیڑنا۔

یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ بھیونڈی میں ایک فریق مسلمان تھا اور دوسرا فریق ہندو۔ جب کہ کراچی میں دونوں ہی فریق یکساں طور پر مسلمان تھے۔ اس ظاہری فرق سے قطع نظر، دونوں جگہ سبب ایک تھا۔ بھیونڈی میں مسلمان نے ہندو کی انا کو چھیڑا اور پھر اس کی سزا بھگتی۔ کراچی میں مسلمان نے مسلمان کی انا کو چھیڑا اور اس کی سزا بھگتی۔

فساد کی حقیقت کیا ہے اور فسادات کیوں ہوتے ہیں، اس کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ —— جب ایک شخص کی انا کو چھیڑا جائے تو وہ بڑا انا بن جاتا ہے، اور اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے:

When one's ego is touched, it turns into super-ego, and the result is breakdown.

پٹرول کے ذخائر کے درمیان ماچس جلائی جائے تو اس کے نتیجہ میں شدید اندیشہ ہے کہ آگ بھڑک اٹھے اور وہ آس پاس کی تمام چیزوں کو جلا ڈالے۔ اسی طرح ہر آدمی اپنے سینہ میں ایک نہایت تیز قسم کا آتش گیر مادہ لیے ہوئے ہے جو معمولی ٹھیس سے بھڑک اٹھتا ہے اور کچھ دیر کے لیے آدمی کو بے قابو بنا دیتا ہے۔ یہ مادہ انا (ایگو) ہے۔

پٹرول کے ذخائر کے درمیان دھماکہ سے بچنے کا واحد راز یہ ہے کہ وہاں ماچس نہ جلائی

جائے۔ اسی طرح انسانوں کے درمیان ان کے غیظ و غضب سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ان کی انا کو نہ چھیڑا جائے۔ انا کو چھیڑنے کے بعد ہمیں لازماً فریق ثانی کی غضب ناکی کا شکار ہونا پڑے گا، خواہ یہ فریق ثانی ہندو ہو یا مسلمان۔ خواہ وہ غیر قوم کا ہو یا خود اپنی قوم کا۔

کسی نے نہایت صحیح کہا ہے کہ ——— ہر آدمی کے اندر ایک شیطان سویا ہوا ہے، اس شیطان کو سویا رہنے دو۔ کیوں کہ اگر تم اس کو جگاؤ گے تو وہ سب سے پہلے تم کو اپنی خونخواری کا نشانہ بنائے گا۔

ملّت کا المیہ

ایک لڑکا باہر سے اپنے گھر میں آتا ہے اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ فلاں لڑکے نے مجھے گالی دی ہے۔ باپ فوراً غصہ ہو جاتا ہے اور باہر نکل کر اس لڑکے سے جھگڑنے لگتا ہے جس کے خلاف اس کے بیٹے نے شکایت کی تھی۔ اس کے برعکس ایک اور باپ ہے۔ اس کا لڑکا باہر سے منھ بنائے ہوئے آیا اور محلہ کے لڑکے کے بارے میں شکایت کی کہ اس نے مجھے گالی دی ہے۔ باپ نے دوسرے لڑکے کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ اس نے صرف اپنے بیٹے کو سرزنش کی کہ تم ایسے لڑکوں کے پاس کیوں گیے۔ کیا تمہارے پاس کرنے کا کوئی اور کام نہ تھا۔

وہ باپ یقیناً جھوٹا باپ ہے جو ہر معاملہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کرتا ہے۔ ایسے باپ کے لڑکوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ آوارہ ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ کوئی ہنر سیکھتے اور نہ تعلیم حاصل کر پاتے۔ آخر کار وہ داداگیری کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں تاکہ اپنی نالائقی کو دوسروں کے اوپر انڈیل سکیں۔ اس کے برعکس دوسرا باپ سچا باپ ہے۔ اس کے لڑکے خود تعمیری کی راہ پر لگتے ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر ترقی کرکے اپنا مستقبل بھی بناتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنی قوم کا مستقبل بھی۔

ہندستان کے مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کے تمام لیڈر، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش، سب کے سب اپنی قوم کے حق میں صرف "جھوٹے باپ" ثابت ہوئے ہیں۔ یہ لیڈر نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ ــــ مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر بے قصور بتا کر ایڈمنسٹریشن کو یک طرفہ طور پر قصوروار ٹھہرانا ہمارے تمام لیڈر بلا استثنار مسلمانوں کے معاملہ میں مسلسل یہی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔

یہ روش کسی قوم کے لیے ہلاکت سے کم نہیں۔ اس کا نقصان تمام فرقہ وارانہ فسادات میں ہونے والے مجموعی نقصان سے بھی سیکڑوں گنا زیادہ ہے۔ قوم کے، قاتل کا لقب اگر صحیح طور پر کسی کے اوپر چسپاں ہوتا ہے تو وہ بلاشبہ یہی مسلم لیڈر ہیں جو قوم کی خیر خواہی کے نام پر قوم کے سب سے بڑے بدخواہ بنے ہوئے ہیں۔

اس قسم کی قومی وکالت قوم کے حق میں حوصلہ کشی کے ہم معنی ہے۔ اس روش کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں سے عمل کا جذبہ چھین لیا ہے۔ اس دنیا میں ہر گروہ ہر حال میں مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ گروہ اگر مسائل کی ذمہ داری خود قبول کرے تو اس کے اندر عمل کا جذبہ ابھرے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے مسائل کی ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال دے تو قدرتی طور پر اس کے اندر عمل کا محرک ختم ہو جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی گروہ کے مسائل کا ذمہ دار دوسروں کو بتانا اس گروہ کو بے عملی کا سبق دینا ہے، اور ہمارے تمام لیڈر مسلسل یہی مجرمانہ فعل انجام دے رہے ہیں۔ ہر معاملہ میں ایڈمنسٹریشن (انتظامیہ) کو ملزم ٹھہرانا بظاہر بہت خوش کن معلوم ہوتا ہے۔ مگر قوم کو اس کی یہ مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے کہ اس کا جذبۂ عمل سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کے افراد کے اندر یہ مزاج بن جاتا ہے کہ ہم جن کمیوں اور خرابیوں سے دوچار ہیں، اس کے ذمہ دار ہم خود نہیں ہیں بلکہ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو ہمیں ان کمیوں اور خرابیوں میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ یہ نفسیات جن لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے وہ "اپنی تعمیر آپ" کی تڑپ سے خالی ہو جاتے ہیں، اور جو لوگ اپنی تعمیر آپ کی تڑپ سے خالی ہو جائیں ان کے لیے مقابلہ کی اس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

مسلم قیادت کی اس مجرمانہ روش کی ایک مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں مسلسل یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ وہاں جو شخص بھی وائس چانسلر ہو کر جاتا ہے۔ شروع میں اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جلد ہی وہ معتوب ہو جاتا ہے۔ اس کے خلاف یونیورسٹی کے مسلم طلبہ ایجی ٹیشن چلاتے ہیں۔ اس ایجی ٹیشن میں مسلم صحافت اور مسلم قیادت بلا استثناء ان کا ساتھ دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وائس چانسلر کو بدنامی کا داغ لے کر یونیورسٹی کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ وائس چانسلر جب علی گڑھ پہونچ کر قریب سے حالات کو دیکھتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ اس "قومی ادارہ" میں بہت سی اندرونی خرابیاں ہیں جو اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ وہاں ایسے "نونہالان ملت" گھسے ہوئے ہیں

جن کو پڑھنے سے زیادہ داداگیری سے دلچسپی ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

وائس چانسلر اس قسم کے عناصر کے خلاف ضروری کارروائی کرتا ہے تاکہ یونیورسٹی کے فاسد عضو کا آپریشن کرکے اس کے بقیہ جسم کو صحت مند بنا سکے ۔ اب جن افراد پر اس اصلاحی عمل کی زد پڑتی ہے ، وہ "اسلام خطرہ میں" اور "یونیورسٹی کا اقلیتی کردار خطرہ میں" جیسے جذباتی نعرے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ وہ اپنے ذاتی مسئلہ کو ایک ملی مسئلہ بنا دیتے ہیں ۔ وہ ہنگامہ بازی کا طریقہ اختیار کرکے یونیورسٹی کی تعلیمی فضا کو درہم برہم کر دیتے ہیں ۔

جب ایسا ہوتا ہے تو ہر بار تمام مسلم قائدین ، خواہ وہ بے ریش قیادت سے تعلق رکھتے ہوں یا باریش قیادت سے ، دوبارہ اسی سبق کو دہرانا شروع کر دیتے ہیں جس کو وہ دوسرے مسلم معاملات میں دہراتے رہے ہیں ۔ وہ وائس چانسلر کو "ایڈمنسٹریشن" کا نمائندہ فرض کر لیتے ہیں اور طلبہ کو "مسلم ملت" کا نمائندہ ۔ اور پھر بلا تحقیق مسلم طلبہ کو معصوم قرار دے کر یک طرفہ طور پر وائس چانسلر کو ملزم ٹھہرانے لگتے ہیں ۔ وہ اپنے الفاظ کے تمام کارتوس اس کے اوپر خالی کر دیتے ہیں ۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان خود یونیورسٹی کو پہنچا ہے ۔ اس نے مسلم یونیورسٹی کے تعلیمی معیار کو مسلمہ طور پر پست کر دیا ہے ۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اب خود اچھے مسلم خاندانوں کے طلبہ کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی "سکنڈ چوائس" بن چکی ہے ۔ یعنی اب وہ مسلم یونیورسٹی میں صرف اس وقت داخلہ لیتے ہیں جب کہ انھیں کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ نہ ملا ہو ۔ حتی کہ وہ مسلم لیڈر جو اخباری بیان میں مسلم یونیورسٹی کے چیمپین بنے ہوئے نظر آتے ہیں ، وہ بھی اپنے بیٹے بیٹیوں کی تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی کے بجائے دوسری یونیورسٹیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں ۔

یہ طریقہ جو ہمارے لیڈروں نے اسلام کے نام پر اختیار کر رکھا ہے ، وہ اسلام تو کیا ہوگا وہ غیر اسلام بھی نہیں ہے ۔ کیوں کہ اسلام خوف خداوندی کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور غیر اسلام حقیقت پسندی کی زمین پر ۔ اور مذکورہ بالا روش کا تعلق نہ خوف خدا سے ہے اور نہ حقیقت پسندی سے ۔

ہندستان کے دستور نے مذہبی اقلیتوں کو یہ خصوصی حق دیا ہے کہ وہ حکومت کی اعانت پر اپنے تعلیمی ادارے قائم کر سکیں۔ اس رعایت کا اطلاق جن مذہبی اقلیتوں پر ہوتا ہے، ان میں سے دو اقلیتیں خاص ہیں۔ ایک مسلمان، دوسرے عیسائی۔ چنانچہ دونوں نے اپنے تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں جن کو حکومت کے خزانہ سے باقاعدہ طور پر مالی امداد دی جاتی ہے۔

مگر دونوں اقلیتوں میں انتہائی نمایاں فرق ہے۔ مسلمانوں نے "اقلیتی ادارہ" کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اس میں مسلم اقلیت کو خصوصی رعایت دی جائے۔ مثلاً مسلمان لڑکے کم نمبر لائیں، حتیٰ کہ فیل ہو جائیں تب بھی انھیں جگہ دی جائے۔ کسی مسلمان طالب علم کو داخلہ سے محروم نہ کیا جائے۔ عیسائی حضرات نے اپنے اقلیتی اداروں میں اس کے بالکل برعکس اصول کی پیروی کی۔ انھوں نے یہ کوشش کی کہ اپنے ادارہ کو اعلیٰ ترین تعلیمی معیار پر ترقی دیں۔ مسلمانوں نے اقلیتی ادارہ کا مطلب اقلیتی رعایت کا ادارہ سمجھا تھا۔ مگر عیسائی حضرات نے اقلیتی ادارہ کو اقلیتی آئیڈیل کا ادارہ بنانے پر ساری توجہ لگا دی۔ انھوں نے داخلہ کے معاملہ میں حد درجہ سختی اور اصول پسندی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی تعلیمی ادارے ملک کے سب سے زیادہ اچھے ادارے سمجھے جانے لگے۔ ان کے معیار کے بارہ میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ "کرسچین اسکول" ہے۔

ایک طرف مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ہیں جو کمتر معیار کے لیے نمونہ بن گیے ہیں۔ دوسری طرف عیسائی حضرات کے تعلیمی ادارے ہیں جو سارے ملک میں برتر معیار کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اب خود صاحب حیثیت مسلمان بڑی بڑی فیس ادا کر کے اپنے بچوں کو عیسائی تعلیمی اداروں میں داخل کرتے ہیں اور ان کو وہاں کا طالب علم بنا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ مزاج میرے نزدیک علمی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ مسلمان اگر آج کی دنیا میں باعزت زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے اداروں کو رعایت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصول کی بنیاد پر چلانا ہوگا۔ اور اس پر حد درجہ سختی کے ساتھ عمل کرنا ہوگا تاکہ مسلمانوں کے ادارے اعلیٰ معیار کا نمونہ بنیں۔ حتیٰ کہ سارے ملک میں وہ طالبان علم کے لیے "فرسٹ چوائس" بن جائیں۔ نہ کہ "سکنڈ چوائس" یا "تھرڈ چوائس" جیسا کہ آج وہ عملاً بنے ہوئے ہیں۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ علیگڑھ کے وائس چانسلر کو سفیر یا گورنر وغیرہ بنا دیا گیا۔ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ " جو شخص بھی یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہو کر آتا ہے، اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ نئی دہلی کو زیادہ سے زیادہ خوش کرے تاکہ آئندہ کے لیے اس کی اعزازی سیٹ محفوظ ہو جائے۔ علیگڑھ کے وائس چانسلر کے لیے نئی دہلی کو خوش کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی کا اسٹینڈرڈ بڑھانے کے نام پر داخلوں میں میرٹ کا اصول جاری کر دے۔ چوں کہ ہندو طلبہ تعلیم میں آگے ہیں اس لیے اس اصول کو جاری کرنے کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے تمام اہم شعبوں (سائنس، انجینیرنگ، طب) پر ہندو طلبہ قابض ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی میں ہر سال مسلمانوں کا تناسب گھٹتا جا رہا ہے۔ اس بنا پر علی گڑھ میں مسلمانوں کو رعایتی داخلے ملنے چاہئیں"
ان حضرات کو شاید معلوم نہیں کہ پاکستان (سندھ) میں بھی ہندو طلبہ وہاں کے سائنس اور انجینیرنگ اور طب کے شعبوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ پھر پاکستان میں کس وائس چانسلر کی " غداری" کی بنا پر ایسا ہو رہا ہے۔

میرے نزدیک اس قسم کا مطالبہ زندگی کا مطالبہ نہیں بلکہ موت کا مطالبہ ہے۔ یہ حقیقتِ واقعہ سے لڑنا ہے۔ اور حقیقتِ واقعہ سے لڑنے والا صرف اپنا سر توڑتا ہے۔ وہ حقیقتِ واقعہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ مسلمانوں کے مطالبہ اور احتجاج کے باوجود یونیورسٹی میں یہ عمل جاری رہے گا، جیسا کہ وہ اب تک جاری رہا ہے۔ خواہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر خود احتجاجی مہم کے کسی لیڈر کو کیوں نہ بنا دیا جائے۔ یہ ایک ناقابل عمل مطالبہ ہے، اور ناقابلِ عمل مطالبہ اس دنیا میں کبھی واقعہ نہیں بنتا۔

یہ مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں کسی کو زندگی کا مقام صرف استحقاق ثابت کرنے پر ملتا ہے۔ اس دنیا میں صرف وہ شخص کامیاب ہوتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ رعایت کی بنیاد پر حق نہ ملے تو وہ امتیاز کی بنیاد پر اپنا حق وصول کرے۔ دنیا اگر اس کو برابری (Equal) کی سطح پر قبول نہ کر رہی ہو تو وہ برابری سے زیادہ (More than equal) کی سطح پر اپنی حیثیت کو منوائے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حقیقت کو بدلنے کے بجائے خود اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کریں۔ علی گڑھ میں اگر مسلمان طلبہ کم ہو رہے ہیں تو انھیں اپنی محنت کو بڑھا کر اس کمی پر قابو پانا چاہیے۔ احتجاج اور مطالبہ کے ذریعہ یہ مسئلہ کبھی حل ہونے والا نہیں۔

ایک واقعہ

ایک لیڈر صاحب سے میری گفتگو ہوئی۔ ان کے دو لڑکے ایک "غیر مسلم" تعلیمی ادارہ میں اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنے لڑکوں کو مسلم یونیورسٹی میں کیوں نہیں داخل کیا، ان کو آپ غیر مسلم ادارہ میں کیوں تعلیم دلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہاں مقابلہ (Competition) کا ماحول ہے، جب کہ مسلم یونیورسٹی میں مقابلہ کا ماحول نہیں اور آپ جانتے ہیں کہ بڑی ترقی حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کا ماحول بے حد ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں آپ جو بیانات دیتے رہے ہیں اس میں آپ نے مسلسل اس نظریہ کی وکالت کی ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں داخلوں کے لیے رعایت (Relaxation) ہونا چاہیے۔ پھر جب بڑی ترقیاں مقابلہ کے ذریعہ ہوتی ہیں تو آپ مسلم یونیورسٹی میں اس کے خلاف ماحول کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عام مسلم طلبہ کے ساتھ اگر مسلم یونیورسٹی میں رعایت نہ کی جائے تو دوسری کون سی جگہ ہے جہاں وہ اپنے لیے رعایت پاسکیں گے۔ پھر ان کا انجام کیا ہوگا۔

میں نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کو ایسے ماحول میں ڈالیں جہاں محنت کا محرک موجود ہو تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے زیادہ سے زیادہ آگے بڑھیں۔ مگر قوم کے بچوں کے لیے محنت کا محرک ختم کرکے انھیں کاہل بنادینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے تعلیمی طور پر پیچھے ہو جائیں۔ اپنے بچوں کو آپ تعلیمی ہیرو دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں کے بچوں کو تعلیمی ہریجن۔

یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈروں کا حال ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے کچھ پسند کرتے ہیں اور ملت کی اولاد کے لیے کچھ۔ یہی وجہ ہے کہ لیڈر اور ان کے متعلقین کامیابی کی راہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ مگر ملت کے حصہ میں اس کے سوا کچھ اور نہ آیا کہ وہ جلسوں کی بھیڑ کے ذریعہ لیڈروں کی شانِ قیادت میں اضافہ کریں اور اس کے بعد بربادی کا نشان بن کر رہ جائیں۔

خلاصۂ کلام

سیاست کی دو قسمیں ہیں۔ ایک باہر رُخی (Outward oriented) سیاست۔ اور دوسرے اندر رُخی (Inward oriented) سیاست۔ باہر رخی سیاست وہ ہے جس میں کسی بیرونی طاقت کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف دھوم مچائی جائے۔ اس کے مقابلہ میں اندر رخی سیاست وہ ہے جس میں اندرونی کمیوں کو نشانہ بنا کر ان کی اصلاح پر ساری طاقت صرف کی جائے۔ پہلے قسم کی سیاست احتجاجِ غیر کا ذہن پیدا کرتی ہے اور دوسرے قسم کی سیاست تعمیرِ خویش کا۔

یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کے درمیان نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے باہر رخی سیاست کا ہنگامہ جاری ہے۔ یہ بلاشبہ جھوٹی سیاست ہے۔ اس قسم کی سیاست کچھ سطحی لیڈروں کے لیے ذاتی طور پر مفید ہو سکتی ہے، مگر وسیع تر ملت کے لیے وہ یقینی طور پر زہر ہے۔ موجودہ مقابلہ کی دنیا میں ترقی کا واحد راز ذاتی جدوجہد ہے، اور یہی وہ قیمتی سرمایہ ہے جس سے لیڈروں کی موجودہ قسم کی سیاست نے مسلمانوں کو محروم کر کے رکھ دیا ہے۔

یہ دنیا جدوجہد کی دنیا ہے۔ یہاں رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھنا ہے۔ یہاں مخالفتوں کے باوجود اپنے لیے راہ نکالنا ہے۔ جو لوگ اس امتحان میں پورے اتریں، وہی اس دنیا میں کامیاب ہوں گے۔ اور جو لوگ اس امتحان میں پورے نہ اتریں، ان کے لیے خدا کی اس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

تعمیر کے نام پر تخریب

۶۷ - ۱۹۶۶ کا زمانہ شمالی ہندستان کی مسلم سیاست میں بڑے جوش وخروش کا زمانہ تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس سیاست کے ہیرو تھے۔ ان پر اور ان کے ساتھیوں پر اچانک یہ راز منکشف ہوا کہ وہ اپوزیشن پارٹیوں کے انتخابی اتحاد میں شریک ہو کر حکمراں کانگرس کو اقتدار سے ہٹا سکتے ہیں اور اس طرح ملک میں اپنے لئے باعزت زندگی کا حق وصول کر سکتے ہیں۔ نان کانگریسیزم کی اس منفی سیاست پر مولانا موصوف کو اتنا یقین تھا کہ انھوں نے اپنی شخصیت کا پورا وزن اس کے خانہ میں ڈال دیا۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> "گزشتہ دو ماہ میں ہم نے کیا حاصل کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کوئی کھوئی ہوئی امت اگر خود کو تلاش کر لے تو یہ کولمبس کے نئی دنیا کی تلاش کرنے کے کارنامہ سے بھی زیادہ عظیم ہے (ندائے ملت ۳۱ مارچ ۱۹۶۷)

جھوٹے فخر کی یہ غذا مسلمانوں کی نفسیات کے نہایت حسب حال تھی۔ چنانچہ بھیڑ کی بھیڑ اس نعرہ پر ٹوٹ پڑی جس میں سمندروں کو عبور کرنے کی مصیبت اٹھائے بغیر کولمبس سے زیادہ بڑی دریافت صرف دو ماہ میں حاصل ہو رہی تھی۔

تاہم اس سطحی سیاست پر میرا دل بہت دکھی تھا۔ میں نے اسی زمانہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے خط وکتابت کی۔ میں نے لکھا کہ میں آپ سے مل کر گفتگو کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم کروں کہ آپ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہے کہ ـــــــ "ہم نے اپنے آپ کو پا لیا ہے"۔ مگر مولانا موصوف نے ملاقات کا وقت نہیں دیا۔ انھوں نے لکھا کہ اس سلسلے میں ان کے قریبی رفقاء مولانا محمد منظور نعمانی اور ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے گفتگو کروں۔

۱۵ اپریل ۱۹۶۷ کو میں نے لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانی سے ملاقات کی۔ میں نے دلائل کی روشنی میں بتایا کہ آپ حضرات کی موجودہ سیاست سراسر لایعنی سیاست ہے۔ اس کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو ملنے والا نہیں۔ بلکہ تقریباً یقینی ہے کہ اس قسم کے اقدام کے بعد حالات اور زیادہ بگڑ جائیں۔ مگر کھلے کھلے دلائل کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور اپنے

سیاسی مسلک سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ بالآخر میں کچہری روڈ (لکھنو) کی مسجد سے اس طرح اٹھا کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا اور میری زبان پر عربی کا یہ شعر تھا:

اذا کان الغـــراب رئیس قوم ــــ سیھدیھم الی دار البـــوار

اس کے بعد ۱۷ اپریل ۱۹۶۷ کو ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (۱۹۱۳ - ۱۹۷۴) سے ان کی لکھنؤ کی قیام گاہ (حضرت گنج) میں ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ مل کر بالفرض آپ کانگرس کو اقتدار سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے مسلمانوں کی قسمت ہرگز بدلنے والی نہیں۔ کیوں کہ اس کے بعد جس کو اقتدار ملے گا وہ آپ نہیں ہوں گے بلکہ کانگرس ہی کی طرح کے دوسرے لوگ ہوں گے۔ یہ گفتگو پون گھنٹہ تک جاری رہی۔ جب وہ میرے دلائل کا جواب دینے سے عاجز ہوگئے تو انھوں نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی:

اسٹیٹس کو (حالت موجودہ) میں چینج (تغیر) تو ہوگا

۱۹۶۷ کے الکشن کے نتیجہ میں اسٹیٹس کو میں چینج ہوا مگر اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کانگرسی عناصر کی جگہ جن سنگھی عناصر حکومت میں غالب آگئے۔ ''نئی دنیا کی دریافت'' نئی سیاسی خندق میں گرنے کے ہم معنی بن گئی۔ شاید نادانی کی یہی وہ قسم ہے جس کے بارہ میں انگریزی کہ یہ کہاوت بنی ہے کہ ـــــ بیوقوف لوگ وہاں جاگھستے ہیں جہاں فرشتے قدم رکھنے سے گھبراتے ہیں:

Fools rush in where angels fear to tread

" اسٹیٹس کو میں چینج " کی اس منفی سیاست میں مسلمان پچھلے سو سال سے مبتلا ہیں۔ وہ پرشور سیاست چلا کر ایک برائی کو ہٹاتے ہیں اور اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ نئی شدید تر برائی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس قسم کی سیاست اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر باطل ہے۔ ایک فساد کو دوسرے فساد سے تبدیل کرنا شیطان کے کارندوں کا طریقہ ہے نہ کہ خدا کے پیغمبروں کا۔

پاکستان میں مخصوص اسباب کے تحت اس قسم کی تخریبی سیاست کے لئے خصوصی مواقع موجود تھے۔ چنانچہ پچھلے تقریباً ۴۰ سال سے یہ ملک اس قسم کی بے معنی سیاست کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ یہاں بار بار یہ واقعہ ہو رہا ہے کہ عہد ساز مفکرین اکھیڑ پچھاڑ کے ذریعہ ایک سیاسی تبدیلی لاتے ہیں، صرف اس لئے کہ بعد کو یہ اعلان کریں کہ نیا دور پچھلے دور سے بھی زیادہ برا ثابت ہوا ہے۔ مزید یہ کہ سطحیت کے اس دور نے لوگوں کو موقع دے دیا ہے کہ وہ عملاً مخرب اسلام کا کردار ادا کریں۔ اس کے باوجود اپنے معتقدین کے درمیان وہ معمار اسلام کے پرفخر لقب سے یاد کئے جاتے رہیں۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں نواب زادہ لیاقت علی خاں کی حکومت قائم ہوئی ۔ اس وقت سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے کچھ ایسے "تغیر پسند عناصر" پالئے جن کے ساتھ مل کر وہ لیاقت علی خاں کی "غیر اسلامیت" کے خلاف ہنگامہ آرائی کر سکیں ۔ یہ تحریک اس طرح ختم ہوئی کہ ۱۹۵۱ میں ایک شخص نے لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا ۔ اس کے بعد پاکستان میں اکھیڑ پچھاڑ ہوتی رہی ۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۸ میں جنرل محمد ایوب خاں برسراقتدار آگئے ۔

اب سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان پر منکشف ہوا کہ جنرل ایوب خاں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ بری ہے ۔ یہ قاعدہ ہے کہ سماج میں ہمیشہ قائم شدہ نظام کے خلاف ناراضگی پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کو دوبارہ کچھ تغیر پسند عناصر مل گئے اور انھوں نے جنرل محمد ایوب خاں کے خلاف ہنگامہ آرائی کی سیاست شروع کر دی یہ سیاست مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی آخر کار اس منزل تک پہنچی کہ گیارہ سالہ اقتدار کے بعد جنرل ایوب کو تخت سے ہٹ جانا پڑا ۔ اس کے بعد الکشن ہوا جس کے نتیجہ میں ۱۹۷۱ میں ذوالفقار علی بھٹو پاکستان میں برسراقتدار آگئے ۔

اب سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان پر دوبارہ اس سیاسی حقیقت کا انکشاف ہوا کہ بھٹو کا دور ایوب کے دور سے بھی زیادہ برا ہے ۔ چنانچہ دوبارہ انھیں اپنے سیاسی جہاد کے لئے ساتھیوں کی تلاش ہوئی جو حسب معمول بہت جلد حاصل ہو گئے ۔ مسٹر بھٹو کے خلاف یہ مہم بالآخر اس شکل میں کامیاب ہوئی کہ ۱۹۷۷ میں پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق کا اقتدار قائم ہو گیا ۔ اور بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان نے ابتداءً اپنے سیاسی مقاصد کے تحت جنرل ضیاء الحق کا مکمل ساتھ دیا ۔ مگر تازہ ترین خبروں کے مطابق ان علم برداران انقلاب پر دوبارہ یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ جنرل ضیاء کا دور حکومت بھٹو کے دور حکومت سے بھی زیادہ برا ہے ۔

پاکستان کی جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اس سلسلے میں مفصل قرار دادیں پاس کی ہیں ۔ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان سے متعلق اس کی قرارداد کا ایک حصہ حسب ذیل ہے :

" (جنرل محمد ضیاء الحق کی) حکومت اور اس کی انتظامیہ نے تعلیمی اداروں کے سکون کو جس بے تدبیری اور بے دردی سے تہ و بالا کر دیا ہے اس نے پوری قوم کے ہر خیر خواہ کو سخت

حیرت زدہ کر دیا ہے۔ یونینوں کے انتخاب بخیر و خوبی انجام پائے ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے، تھے کہ بغیر کسی وجہ جواز یونینوں اور طلبہ تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی اور اس اقدام کے خلاف تعلیمی اداروں کے اندر بھی احتجاج کے سارے دروازے طلبہ پر بند کر دئے گئے۔ اس کے بعد ظلم و زیادتی کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے جس نے بھٹو اور کھر کے دور کو بھی مات کر دیا ہے۔ طلبہ کے منتخب نمائندوں کو کالج اور ہوسٹلوں سے اخراج پر طلبہ کا احتجاج بالکل فطری امر تھا۔ اس پر سولہ سترہ سال کے لڑکوں کو ننگا کر کے پیٹا گیا ہے۔ ان کو لاٹھیوں اور دوسرے اسلحہ سے زدو کوب ہی نہیں کیا گیا ہے، ان کے ہاتھوں سے ناخن نوچے گئے اور ان کے جسم کے نازک حصوں کو جلتی موم بتیوں اور سگرٹ لائٹرز سے جلایا گیا ہے۔ ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر کئی کئی دن اس طرح رکھا گیا ہے کہ وہ کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے۔ ان کو نماز تک پڑھنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اور نماز کی درخواست پر ان کی پٹائی کے علاوہ نہایت غلیظ گالیوں کی بوچھار کی گئی۔ صرف طلبہ ہی نہیں، ان کے بہن بھائی اور بوڑھے والدین تک کو گرفتار کر کے تھانوں میں محبوس رکھا گیا۔ اور ان کے باپوں ہی کو نہیں ماؤں کو بھی زدو کوب کیا اور غلیظ گالیوں سے نوازا گیا ہے۔ اعلےٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کوڑوں کی سزائیں دی گئی ہیں اور حکومت کے ذمہ دار ترین افراد کو توجہ دلانے اور ان حقائق سے آگاہ ہونے کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ حکومت ظلم و ستم کے ہر حربے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اور اپنے پیش رو جابر و ظالم حکمرانوں کے انجام سے کوئی سبق سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔۔۔۔ اقتدار سے بڑھ کر ناپائدار کوئی شے نہیں ہے۔ یہ کرسی جس پر صدر (ضیاء الحق) صاحب کو اس قدر بھروسہ ہے، ان کے پیشرو کو بھی آخری لمحہ تک انتہائی مضبوط نظر آتی تھی۔ اس لئے ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ وہ کرسی پر تکیہ کرنے کے بجائے عدل و انصاف کا راستہ اختیار کریں۔" (زندگی، جون ۱۹۸۴)

مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن میں بھٹو پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور مخالف پارٹیوں کے ساتھ مل کر بھٹو حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کیا جو توڑ پھوڑ تک جا پہنچا۔ ان حالات نے فوجی افسروں کو موقع دے دیا۔ اور وہ بھٹو کو گرفتار کر کے جولائی ۱۹۷۷ میں حکومت پر قابض ہوگئے۔ اب اگر مذکورہ قرارداد کے مطابق پاکستان کی فوجی حکومت ظالم ہے تو اس سے بڑے ظالم وہ لوگ ہیں جن کی جھوٹی سیاست نے اس ظالم حکومت کو برسراقتدار آنے کا موقع دیا۔

جماعت اسلامی ہند کے سرکاری ترجمان ماہنامہ زندگی (جون ۱۹۸۴) نے جماعت اسلامی

پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مذکورہ قرارداد اپنے صفحات میں نقل کی ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک نوٹ لکھا ہے جس میں یہ الفاظ درج ہیں:

"یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ وہ امت مسلمہ کو ان سربراہوں، لیڈروں اور حکمرانوں سے کب نجات بخشے گا جو عملی نفاق میں مبتلا ہیں۔"

ماہنامہ زندگی نے اس صورت حال کی ذمہ داری نہایت معصومانہ انداز میں "حکمرانوں" پر ڈالی ہے۔ حالاں کہ اس کی ذمہ داری خود سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ لوگ "اسٹیٹس کو میں چینج" کو کام سمجھتے رہے۔ حالاں کہ نتیجہ کے اعتبار سے وہ فساد اور تخریب کے سوا اور کچھ نہ تھا حقیقت یہ ہے کہ زیادہ قرین انصاف بات یہ تھی کہ ماہنامہ زندگی لکھتا کہ "یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ وہ امت مسلمہ کو جھوٹے اسلامی رہنماؤں سے کب نجات بخشے گا۔" اس کے برعکس اس نے یہ کیا کہ ساری ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال دی۔

افسوس کہ لوگوں میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ وہ سیدھی طرح اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ وہ اپنی کھلی کھلی حماقتوں کا الزام بھی دوسروں کے سر پر ڈالنا چاہتے ہیں، صرف اس لئے کہ ان کا فخر ان سے نہ چھنے۔ اپنے جس قائد کو انھوں نے بطور خود عہد ساز مفکر کا لقب دے رکھا ہے وہ بدستور اپنی جگہ پر باقی رہے۔

آپ کانٹے دار درخت کو پھل دار درخت بتا کر اس کا بیج بوئیں اور جب اس سے کانٹوں کا درخت ظاہر ہو تو اس کی ساری ذمہ داری زمین پر ڈال دیں تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اپنی نااہلی کا الزام خدا کو دینا ہے۔ اگرچہ یہ بے حد سخت بات ہے مگر اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں ہمارے لیڈر ساری دنیا میں یہی کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر ایک ہنگامہ اٹھاتے ہیں اور جب قانون قدرت کے تحت ان کی ہنگامہ آرائیوں کا الٹا نتیجہ سامنے آتا ہے تو فوراً اس کی تمام ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کہہ کر وہ خدا کی سچائی کو مشتبہ کرنا چاہتے ہیں نہ کہ کسی انسان کی سچائی کو۔ کیوں کہ جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ براہ راست قدرت کے قانون کی بنا پر برآمد ہوا ہے نہ کہ حقیقۃً کسی انسان کی بنا پر۔

کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں خود اپنی مرضی کی دنیا بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ٹھنٹھ کو شاداب درخت کا نام دے رہے ہیں۔ وہ اپنے بے نور دئے پر روشن چراغ کا لیبل لگا کر خوش ہیں۔ وہ اپنی جھوٹی بڑائی کو ہر حال میں باقی رکھنا چاہتے ہیں خواہ اس کی وجہ سے خدا کی بڑائی مجروح ہو جائے۔

احتجاج بے فائدہ

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) سے لے کر اب تک کی پوری تاریخ میں ہندستانی مسلمانوں نے جس مسئلہ پر سب سے زیادہ دھوم مچائی ہے وہ شاہ بانو بیگم کا مشہور معاملہ ہے۔ محمد احمد خاں ۔ شاہ بانو بیگم کیس (Criminal Apeal No. 103 of 1981) اپر ہندستان کی سپریم کورٹ نے ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ کو فیصلہ دیا۔ اس فیصلہ میں سپریم کورٹ نے مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کو باقی رکھا کہ محمد احمد خاں اپنی مطلقہ بیوی شاہ بانو بیگم کو 179.20 روپیہ ماہانہ بطور گزارہ (Maintenance) ادا کریں۔

یہ فیصلہ جو (Criminal P.C. (2 of 1974) S. 125-Maintenance) کے تحت دیا گیا تھا، اس میں فاضل جج نے قرآن کی آیت کا بھی حوالہ دیا اور یہ کہا کہ مطلقہ عورت کو گزارہ دینا عین قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ انھوں نے اپنے فیصلہ میں قرآن سے سورہ البقرہ کی آیت ۲۴۱ نقل کی۔ سپریم کورٹ نے اپنے انگریزی فیصلہ میں اصلاً قرآن کے جس انگریزی ترجمہ پر انحصار کیا وہ عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ تھا۔ انھوں نے مذکورہ آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے :

For divorced women maintenance (should be provided) on a reasonable (scale). This is a duty on the righteous.

قرآن کی مذکورہ آیت میں "متاع" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ عبداللہ یوسف علی نے Maintenance کے لفظ سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں دو لفظ بالکل الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ ایک متاع، دوسرے نفقہ۔ متاع کا مساوی لفظ انگریزی زبان میں Provision ہے۔ اور نفقہ کا مساوی لفظ Maintenance ہے۔ اس اعتبار سے مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ اس میں (Provision) کا لفظ استعمال کیا جائے جو وقتی عطیہ کے ہم معنی ہے۔ مگر عبداللہ یوسف علی نے غلط طور پر اس کے ترجمہ میں Maintenance کا لفظ استعمال کیا جو مستقل گزارہ کا مفہوم رکھتا ہے۔

سپریم کورٹ نے عبداللہ یوسف علی کے اس ترجمہ سے فائدہ اٹھایا اور مطلقہ کو ماہانہ گزارہ

دینے کی ہدایت جاری کردی، جب کہ آیت کے اصل الفاظ کے مطابق مطلقہ کے لیے صرف بوقت رخصت کچھ نقد یا سامان دینے کی گنجائش نکلتی تھی۔

قرآن کے اعتبار سے مذکورہ فیصلہ بلاشبہ غلط تھا۔ مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں نے کیا کیا۔ انھوں نے اپنی ساری توجہ صرف سپریم کورٹ کے فیصلہ پر لگا دی نہ کہ مسلمان مترجم کے انگریزی ترجمہ پر۔ انھوں نے سپریم کورٹ کے خلاف تو اتنا طوفان اٹھایا کہ زمین و آسمان ایک کر دیا۔ مگر مسلمانوں کی کسی بھی جماعت یا کسی بھی قابل ذکر مسلم لیڈر کے اندر یہ تڑپ پیدا نہیں ہوئی کہ انگریزی کا ایک صحیح اور مستند ترجمۂ قرآن وجود میں لایا جائے تا کہ آئندہ کسی "دشمنِ اسلام" کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ ہمارے اپنے ترجمہ کا حوالہ دے کر ہمارے خلاف شر انگیزی کر سکے۔

واٹر ٹینک کا پانی بہہ کر چھت سے نیچے آرہا ہو تو زمین کی قوت کشش کے خلاف شور وغل کرنا بے فائدہ ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ واٹر ٹینک کا سوراخ بند کیا جائے۔ اسی طرح آپ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کوئی شخص آپ پر وار کرے تو دوسرے شخص کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے اپنی کمزوری کو دور کرنے میں لگ جائیے، اس کے بعد آپ خود بخود دوسروں کے وار سے محفوظ ہو جائیں گے۔

دوسری مثال

چاندمل چوپڑا نے ۱۹۸۵ میں بنگال ہائی کورٹ میں ایک رِٹ کی اپیل داخل کی۔ اس میں ہائی کورٹ سے کہا گیا تھا کہ وہ دستور ہند کی دفعہ ۲۲۶ کے تحت حکومت مغربی بنگال کے نام ہدایت جاری کرے کہ وہ قرآن کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی عائد کردے۔ چاندمل چوپڑا نے اپنی اپیل میں قرآن کے انگریزی ترجموں سے مختلف آیتیں نقل کی تھیں اور کہا تھا کہ یہ آیتیں اپنے پڑھنے والے کے اندر لڑائی کی اسپرٹ ابھارتی ہیں اور اس طرح ملک کے اندر قیام امن میں رکاوٹ ہیں۔

چاندمل چوپڑہ کی یہ درخواست بلاشبہ لغو تھی، اور اس کی اسی لغویت کی بنا پر مسٹر جسٹس باسک نے ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو اس کے خلاف فیصلہ دیا اور یہ کہہ کر اسے خارج کر دیا:

... for the aforesaid reasons this application stands dismissed (Para 40).

چاندمل چوپڑا کے دعوے کی بنیاد دوبارہ قرآن کے وہ ترجمے تھے جن میں کثرت سے غلطیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر چاندمل چوپڑا نے اپنی اپیل میں قرآن کی سورہ الحج (آیت ۳۹) کا حوالہ دیا تھا۔ اس آیت کا ترجمہ محمد مارڈیوک پکتھال نے ان الفاظ میں کیا ہے:

Sanction is given unto those who fight ...

اس ترجمہ سے بظاہر یہ نکلتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کو لائسنس دے رہا ہے کہ وہ دوسروں کے خلاف لڑائی چھیڑیں اور ان سے جنگ وقتال کریں۔ اور اسی ترجمہ کو چاندمل چوپڑا نے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ مگر یہ ترجمہ بجائے خود غلط ہے۔ قرآن کا اصل لفظ یقاتَلون (ت پر زبر) ہے، مگر مترجم نے اس کے برعکس یقاتِلون (ت پر زیر) کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس غلطی کی وجہ سے آیت کا مطلب بالکل الٹ گیا۔ اس آیت کا صحیح انگریزی ترجمہ یہ ہوگا:

Sanction (to take up arms) is given to those who are attacked ..

قرآن کے اصل لفظ (اور اس کے صحیح ترجمہ کے مطابق) اس آیت میں دفاع کے طور پر لڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر غلط ترجمہ کے نتیجہ میں یہ آیت جارحانہ جنگ کے ہم معنی بن گئی، اور چاندمل چوپڑا جیسے لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ اس غلط ترجمہ کو لے کر اسلام کو خونخوار مذہب ثابت کریں اور عدالت سے لے کر پریس تک اس کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم چلائیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد خود مسلمانوں نے کیا کیا۔ مسلم اخبارات نے چاندمل چوپڑا کے خلاف دھواں دھار مضامین شائع کیے اور مسلم لیڈروں نے اس کو ایک خطرناک سازش ظاہر کرنے کے لیے خطابت کا سارا زور صرف کر دیا۔ مگر مسلمانوں میں سے کوئی بھی تنظیم یا کوئی بھی قابل ذکر شخصیت ایسی نہیں نکلی جس کو یہ واقعہ بے تاب کر دے کہ انگریزی زبان میں قرآن کا کوئی صحیح اور قابل اعتماد ترجمہ موجود نہیں۔ اور پھر وہ اس منصوبہ پر عمل شروع کر دے کہ ایک صحیح اور قابل اعتماد انگریزی ترجمہ تیار کر کے شائع کیا جائے تاکہ چاندمل چوپڑا جیسے

فتنوں کی جڑ ہمیشہ کے لیے کٹ جائے۔

ملّت کی کہانی

یہ دو مثالیں محض منفرد مثالیں نہیں۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی پوری کہانی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی وہ اصل کمزوری کیا ہے جس نے ان کو موجودہ زمانہ میں بربادی سے دوچار کر رکھا ہے۔ وہ پچھلی نصف صدی سے صرف ایک ہی کام کر رہے ہیں ــــــ دوسروں کو نشانہ بنا کر ان کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنا۔ وہ اپنی داخلی اصلاح اور اپنے اندرونی استحکام کے میدان میں کوئی حقیقی کام انجام نہ دے سکے۔

قرآن کا یہ فیصلہ (آل عمران ۱۲۰) ہے، اور تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ جب بھی کوئی خارجی طاقت کسی گروہ کو نقصان پہنچائے تو یہ درحقیقت خود نقصان پذیر گروہ کی داخلی کمی کی بنا پر ممکن ہوتا ہے۔ خربوزے کا کٹنا چھری کی سنگ دلی سے زیادہ خربوزے کی اپنی کمزوری (Vulnerability) کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ تمام عقل مند لوگ ہمیشہ یہی کرتے ہیں کہ جب وہ کسی خارجی عنصر کی طرف سے کسی نقصان سے دوچار ہوتے ہیں تو فوراً وہ اپنے کمزور پہلو (Vulnerable point) کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، تاکہ اس کی اصلاح کر کے خارجی زیادتیوں کے خلاف بند بنا سکیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ انتہائی نادانی کے ساتھ صرف دوسروں کے خلاف چیخ پکار کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی داخلی کمیوں کو درست کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر اب تک ان کے احوال درست نہ ہو سکے۔

اس معاملہ میں پوری مسلم ملت نے حبل اللہ کو کھو دیا ہے۔ وہ اسلام کی تعلیم سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے، تو موجودہ مسلمان سب کے سب دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے احتجاجی سیاست کو بطور قیادتی پیشہ کے اختیار کر رکھا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو کلی یا جزئی طور پر اس قسم کی سیاست سے الگ ہیں۔ تاہم وہ پہلے طبقہ کے خلاف کھل کر نکیر نہیں کرتے۔ وہ ان پر مشخص اور متعین تنقید نہیں کرتے۔ اور اگر بالفرض کبھی کچھ کہتے ہیں تو ان کا یہ کہنا انھیں اس سے نہیں روکتا کہ وہ حدیث کے الفاظ میں، اس کے اکیل اور خلیط

اور شریک نہ بنیں۔ گویا کہ پوری ملت اس وقت ایک ہی کام میں مشغول ہے، اور وہ احتجاجی سیاست ہے، ایک طبقہ اس میں براہِ راست طور پر ملوث ہے اور دوسرا طبقہ بالواسطہ طور پر۔

یہ بے حد خطرناک علامت ہے۔ کیوں کہ قرآن و حدیث کے مطابق یہ وہ چیز ہے جو قوموں کو غضب الٰہی کا مستحق بنا دیتی ہے۔

یہ کھلی ہوئی اسلام کی خلاف ورزی ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے معاملات میں اسلام کا طریقہ احتجاج نہیں ہے بلکہ احتساب ہے۔ اس طرح کے قومی امور میں ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اپنی داخلی کوتاہیوں کو تلاش کر کے ان کی اصلاح میں سرگرم ہوں، نہ یہ کہ کسی خارجی عنصر کو "ظالم" قرار دے کر اس کے خلاف شور و غل میں مشغول ہو جائیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی غلط روش کو واضح کرنے کے لیے میں اسلامی تاریخ سے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

احد کے موقع پر مکہ کے لوگ چڑھائی کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ حنین میں قبیلہ ہوازن نے دھوکا دے کر مسلمانوں کے اوپر حملہ کر دیا تھا۔ ان دونوں مواقع پر مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس اعتبار سے بظاہر یہ ہونا چاہئے تھا کہ دونوں معاملات میں مسلمانوں کے نقصان کی ساری ذمہ داری فریق ثانی پر ڈال کر صرف اسی کو برا بھلا کہا جائے۔ مگر اس کے باوجود قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ تمہاری فلاں فلاں کمزوریوں نے فریق ثانی کو یہ موقع دیا کہ وہ تمہارے خلاف اپنے دشمنانہ منصوبہ میں کامیاب ہو سکیں۔

غزوۂ احد ۳ھ میں ہوا، اور غزوۂ حنین ۸ھ میں۔ یہ دونوں واقعات خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئے۔ چنانچہ ان دونوں کے بارے میں قرآن میں تبصرہ نازل ہوا۔ اس لحاظ سے یہ دونوں معیاری نمونے ہیں جن پر ہمیں اپنے مسائل کو جانچنا چاہیئے۔

اس اعتبار سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ قرآن کا انداز سراسر اس کے برعکس ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلم قائدین نے اختیار کر رکھا ہے۔ موجودہ مسلم قائدین کی روش کے خلاف، قرآن نے فریق ثانی کے "ظلم اور سازش" کے بارہ میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے دونوں لڑائیوں کے نقصان کی ذمہ داری خود مسلمانوں کی بعض کمزوریوں پر ڈالی۔ احد کے واقعہ کے بارے میں قرآن نے یہ کہا کہ تمہارے اختلاف و نزاع (آل عمران ۱۵۲) کی وجہ سے تمہیں یہ

نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی طرح حنین کے بارہ میں قرآن نے اعلان کیا کہ اس موقع پر تمہیں جس نقصان سے دوچار ہونا پڑا، اس کا سبب تمہارا فخر اور عجب (التوبہ ۲۵) تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر خدائی پکڑ سے ڈرتے ہوں اور قرآن وسنت کو اپنی زندگی کا رہنما بنائیں تو ان کے لیے کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ اپنے مصائب کا الزام دوسروں کو دے کر ان کے خلاف چیخ پکار کا موجودہ مشغلہ مکمل طور پر بند کر دیں۔ اس کے برعکس ان کے تمام مفکرین اور رہنما صرف اس ایک مہم میں لگ جائیں کہ وہ مسلمانوں کی ان داخلی کمزوریوں کو دور کریں جس کی وجہ سے دوسروں کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ انھیں اپنے مخالفانہ عزائم کا نشانہ بنائیں اور ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔

جس دن مسلمانوں کی داخلی کمزوریاں ختم ہوں گی، اسی دن اغیار کے تمام مخالفانہ منصوبے بے زمین ہو کر رہ جائیں گے اور آخر کار اپنی موت آپ مر جائیں گے۔

قومی اسلام

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیاتی حالت بیان کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کا قول موزوں ترین ہوگا۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا :

میں مسلمان ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں مسلمان ہوں

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ جملہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی صحیح ترین تصویر ہے۔ مگر ان کی اسی صحیح تصویر میں ان کے المیہ کی پوری داستان بھی چھپی ہوئی ہے۔

مذکورہ فقرے پر غور کیجیے۔ "مسلمان" کے لفظ کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد قرآنی انسان ہو۔ اگر اس سے قرآنی انسان مراد لیا جائے تو اس سے وہ انسان مراد ہوگا جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ مگر مذکورہ فقرہ کو اس معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قرآنی مفہوم کے اعتبار سے یہ فقرہ بالکل لغو ہے۔ اس کی لغویت کو نہایت آسانی کے ساتھ اس وقت سمجھا جاسکتا ہے جب کہ اس کے الفاظ کو بدل دیا جائے۔ آپ "مسلمان" کی جگہ "اللہ سے ڈرنے والا" رکھ دیجئے اور پھر اس کو اِس طرح کہیے :

میں اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں اللہ سے ڈرنے والا ہوں

دیکھیے، لفظ کو بدلتے ہی یہ فقرہ بالکل بے معنی معلوم ہونے لگا۔ کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو واقعۃً اللہ سے ڈرتا ہو اور وہ اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرے۔ کیوں کہ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے نہ کہ فخر۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا مذکورہ فقرہ قرآنی مفہوم میں نہیں ہے۔ وہ یقینی طور پر کسی اور مفہوم میں ہے۔

یہ دوسرا مفہوم کیا ہے۔ یہ قومی اور تاریخی مفہوم ہے۔ اس فقرہ میں "مسلمان" کا لفظ اس قوم یا اس نسل کے ایک فرد کے لیے بولا گیا ہے جو ایک خاص تاریخ سے وابستہ ہے۔ جس کے اسلاف نے ملک فتح کیے۔ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں۔ شاندار تمدن پیدا کیا۔ دنیا میں اپنی سیاسی اور مادی عظمت قائم کی۔ اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے دیکھیے تو مذکورہ فقرہ بالکل درست نظر آئے گا۔ اِس دوسرے مفہوم میں لینے کی صورت میں اس فقرہ کی وہ لغویت ختم ہو جائے گی جو پہلے مفہوم میں لینے

کی صورت میں نظر آتی تھی ۔

یہ تجزیہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کا مسلمان قرآن کی پیداوار نہیں، وہ تاریخ کی پیداوار ہے ۔ اس کا سرمایہ قومی فخر ہے نہ کہ قرآنی حقیقتوں کی دریافت ۔ موجودہ مسلمان دوسری قوموں کی طرح ایک قوم ہیں نہ کہ وہ امت جو خدا اور رسول کی بنیاد پر فکری اور روحانی انقلاب کے ذریعہ ظہور میں آئی ہو ۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ حالت اتنی عام ہے کہ اس میں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ۔ ایک ہی رنگ ہے جس میں تمام مسلمان رنگے ہوئے ہیں، خواہ وہ ان کے چھوٹے ہوں یا ان کے بڑے ۔ وہ ان کے پڑھے لکھے لوگ ہوں یا بے پڑھے لکھے لوگ ۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں ۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے ۔ موجودہ مسلمانوں کو فخر والا اسلام ملا ، انھیں تواضع والا اسلام نہیں ملا ۔ بالفاظ دیگر، انھوں نے تاریخ کو پایا مگر انھوں نے خدا کو نہیں پایا ۔ ایسی حالت میں ان کے اندر وہ صفات کیسے پیدا ہو سکتی تھیں جو صرف اس انسان یا اس گروہ میں پیدا ہوتی ہیں جو خدا کو اس طرح پائے کہ وہ اس کے پڑوس میں اپنے صبح و شام گزارنے لگے ۔

مسلمانوں کی اسی نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر معاملہ میں ان کا رویہ قومی رویہ بن کر رہ گیا ہے ۔ اپنے رسول میں انھیں فخر و مباہات کا سامان ملتا ہے مگر اس میں انھیں اطاعت و پیروی کا سامان نہیں ملتا ۔ ان کا اسلام انھیں لڑائی جھگڑا سکھاتا ہے مگر وہ انھیں صبر اور اعراض کی تعلیم نہیں دیتا ۔ وہ قرآن و سنّت میں انتقام کا سبق پا لیتے ہیں مگر وہ اس کے اندر عفو و درگذر کا سبق نہیں پاتے ۔ جہاد کا یہ مطلب تو ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسری قوموں کو اپنا حریف بنا کر ان سے لامتناہی جنگ چھیڑ دی جائے ، مگر جہاد کا یہ مطلب سمجھنے سے وہ معذور رہتے ہیں کہ دوسری قوموں کو خدا کے دینِ رحمت کی طرف مائل کرنے کے لیے ان کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے ۔

دنیا میں کامیابی کے لیے اعتراف اور مفاہمت اور صبر اور اعراض کی ضرورت ہوتی ہے مگر فخر پسند مسلمانوں کو اس قسم کا رویہ اپنے شایانِ شان نظر نہیں آتا ۔ اس لیے وہ ان کو اختیار بھی نہیں کر پاتے ـــــــ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے ۔

اقبال اور ابوالکلام اور ان کے جیسے دوسرے شاعروں اور خطیبوں نے مسلمانوں کو جو فکری سرمایہ دیا وہ ایک لفظ میں "فخر" تھا۔ انھوں نے اسلام کو فخر کی چیز بنا کر پیش کیا۔ ایک زوال یافتہ قوم کے لیے یہ ایک دل پسند غذا تھی، چنانچہ مسلمانوں نے دوڑ کر اس کو قبول کر لیا۔ آج تقریباً تمام مسلمان جس اسلام پر کھڑے ہوئے ہیں وہ یہی فخر والا اسلام ہے، اور یہی ان کی تمام بربادیوں کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ایک مثال لیجئے۔ ایک بڑے شہر کے مسلم لیڈروں کو یہ تدبیر سوجھی کہ مسلمانوں کو اٹھانے کے لیے ان کے اندر فخر والا اسلام زندہ کریں۔ انھوں نے مسلم محلّوں کی دیواروں پر جلی حرفوں میں جگہ جگہ یہ جملہ لکھ دیا:

فخر سے کہو کہ میں مسلمان ہوں

اس کے بعد ہندوؤں کی باری تھی۔ ان کے اندر بھی جوابی جوش پیدا ہوا۔ انھوں نے شہر کی سڑکوں پر اور بھی زیادہ جلی قلم کے ساتھ ہر طرف یہ الفاظ لکھ ڈالے:

گورو سے کہو کہ میں ہندو ہوں

اس لفظی جنگ کے نتیجہ میں شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ وہاں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ اس کے برعکس اگر مسلمان ایسا کرتے کہ وہ شہر کی دیواروں پر یہ فقرہ لکھتے:

لوگو، خدا سے ڈرو

تو نہ کوئی مقابلہ اور تناؤ ہوتا اور نہ فساد کی صورت پیدا ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام مسائل ان کے خود ساختہ اسلام کے نتائج ہیں۔ اگر وہ قرآن و حدیث والے اسلام کو پکڑ لیں تو ہر قسم کے فساد کی جڑ کٹ جائے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من تواضع رفعه الله (جو تواضع اختیار کرے اللہ اس کو بلند کرتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز تواضع ہے۔ مگر مسلمانوں کا فخر پسندی کا ذہن عین اپنی طبیعت کے اعتبار سے تواضع کا طریقہ اختیار نہیں کر پاتا، اس لیے خدا کی دنیا میں اس کو سرفرازی بھی حاصل نہیں ہوتی۔

ایک مشورہ

ڈاکٹر رائٹ (Dr Theodore Paul Wright Jr.) ایک امریکی عالم ہیں۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کو اپنے اختصاصی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۷ میں ایل (Yale) یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور ۱۹۶۳ سے ہندستانی مسلمانوں کے معاملات کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا جو کہ تقریباً ایک سو ملین تعداد کے ساتھ انڈونیشیا کے بعد دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ہندستان اور پاکستان کے کئی تفصیلی سفر کر چکے ہیں اور وہ پچھلے تقریباً ۲۵ سال سے خاص اسی موضوع پر پڑھتے اور لکھتے رہے ہیں۔ اس موضوع پر ان کے مقالات ممتاز عالمی جرنلوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر رائٹ نے اپنی کتاب ہندستانی مسلمان (*Muslims in India*) میں لکھا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کا معاملہ بڑی حد تک اس پر منحصر ہے کہ ہندستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔ انھوں نے پاکستانیوں سے کہا ہے کہ آپ لوگوں کو چاہیے کہ غیر موثر انداز میں ان کے مسئلہ کا چمپین بن کر ان کے مسئلہ کو مشکل تر نہ بنائیں :

You shouldn't make things difficult for them
by championing their cause ineffectively.

ڈاکٹر رائٹ نے ہندستان کے مسلمانوں کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ساحلی مسلمان اور اندرونی علاقوں کے مسلمان۔ ساحلی مسلمانوں سے ان کی مراد خاص طور پر جنوبی ہند کے مسلمان ہیں۔ اور اندرونی مسلمانوں سے مراد شمالی ہند کے مسلمان۔ دوسری قسم کے مسلمانوں کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ یادگاری ذہن والے (Monument-conscious) ہیں۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو تاج محل اور لال قلعہ اور چارمینار کے درمیان رہتے ہیں۔ ان کا ذہن ابھی تک انھیں شاہی یادگاروں میں اٹکا ہوا ہے۔ یہ یادگاریں انھیں یہ بھولنے نہیں دیتیں کہ وہ کبھی اس ملک میں حکمراں طبقہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر رائٹ کا کہنا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ذاتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے سماج کا لازمی نتیجہ ہے :

What was happening in India was the inevitable result of
the working of a caste-ridden, communal-oriented society.

ڈاکٹر رائٹ نے حالات کے گہرے تجزیہ کے بعد ہندستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر نمایاں بنالیں تاکہ وہ ہندو (اکثریتی فرقہ) کی غضب ناکی کا شکار نہ ہوں۔ یہ ایسے لوگوں کے لیے بہت سخت مشورہ ہے جو فخر کی نفسیات میں مبتلا ہوں اور اپنی عظمت کے نشانات کے درمیان رہتے ہوں۔ مگر اس کے بغیر وہ فسادات کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرتے رہیں گے، جو بہت مہنگی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں ماننا چاہیے کہ ہندو ساحلی علاقہ کے تجارت پیشہ مسلمانوں کے خلاف بہت کم یا بالکل توجہ نہیں دیتے :

My advice to Indian Muslims is to be inconspicuous so as not to draw Hindu backlash. This is a very hard advice to follow for a proud people living in the midst of their monuments of glory. But then the price they pay is very heavy in terms of the riots that occur. Hindus, let us admit, pay little or no attention to coastal Muslim trading communities.

ہندستانی مسلمانوں پر مسلمان لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے تقریباً تمام قابلِ ذکر حصہ کو راقم الحروف نے پڑھا ہے۔ مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سلسلہ میں اردو یا عربی یا انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان سب پر مذکورہ امریکی مستشرق کی تحریر بھاری ہے۔ کسی بھی مسلم اہلِ قلم نے اس مسئلہ کا اتنا گہرا جائزہ نہیں پیش کیا جیسا کہ مذکورہ امریکی عالم نے پیش کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے ماضی کی پُرفخر یادوں میں اٹکے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اب تک اپنے حال کو نہیں سمجھا اور نہ حال کے مطابق وہ اپنے لیے حقیقت پسندانہ منصوبہ بنا سکے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے بہترین مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس "پچھلی سیٹ" پر بیٹھنے کے لیے راضی کرلیں جہاں حالات نے انھیں پہنچایا ہے۔ جدید ہندستان میں باعزت مقام حاصل کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا جو راستے ان کے لیڈر پیش کر رہے ہیں وہ صرف بربادی میں اضافہ کرنے والے ہیں نہ کہ کامیابی کی طرف لے جانے والے۔

آزمودہ حل

میرے ایک قریبی عزیز ہیں وہ ہندستان کے ایک شہر میں رہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے ۲۴ کمروں کا ایک بڑا مکان بنایا۔ اس سے ملا ہوا ایک ہندو ٹھیکہ دار کا بھی کافی بڑا مکان تھا۔ دونوں کے درمیان ایک خالی زمین تھی۔ اس زمین کے بارے میں دونوں کے درمیان نزاع پیدا ہوئی۔ میرے عزیز کہتے تھے کہ یہ ہماری زمین ہے اور ہندو ٹھیکہ دار کا دعوی تھا کہ وہ ہماری زمین ہے۔

یہ نزاع جاری رہی یہاں تک کہ ہندو ٹھیکیدار نے اس معاملہ میں مقامی جن سنگھی عناصر کو ابھارا۔ ٹھیکہ دار نے ان لوگوں کو بتایا کہ میری زمین پر ایک "مسلمان" نے قبضہ کر رکھا ہے۔ جن سنگھی افراد قدرتی طور پر بھڑک اٹھے۔ چنانچہ ایک روز ان کی پوری جماعت جلوس کی شکل میں آئی اور مذکورہ مسلمان کے مکان کو گھیر لیا۔ وہ جذبات میں بھرے ہوئے تھے اور اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔

مذکورہ مسلمان عمارت کے اوپر کے حصہ میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے اور نیچے ان کا کاروباری دفتر تھا۔ وہ شور سن کر دفتر سے باہر آئے اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاملہ یہ ہے کہ تم نے ہمارے ایک ہندو بھائی کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان لوگوں نے اور بہت سی اشتعال دلانے والی باتیں کہیں۔ مگر مذکورہ مسلمان ذرا بھی غصہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ میں لیڈر کون کون ہیں۔ چند لوگ آگے بڑھے۔ انھوں نے ہجوم سے کہا کہ آپ لوگ یہیں سڑک پر ٹھہریئے۔ ابھی زمین کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لیڈر صاحبان کو اپنے دفتر میں لے آئے۔

یہ گرمی کا موسم تھا۔ پہلے انھوں نے لیڈر صاحبان کی کولڈ ڈرنک سے تواضع کی۔ اس کے بعد ان سے کہا کہ اب بتائیے آپ لوگوں نے کس لیے زحمت فرمائی ہے۔ انھوں نے دوبارہ کہا کہ آپ نے ہمارے ایک ہندو بھائی کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس زمین کو اصل مالک کے حوالہ کیا جائے۔ مذکورہ مسلمان نے نہایت ٹھنڈے انداز میں کہا کہ آپ سب پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ زمین کاغذ پر ہوتی ہے۔ یعنی کاغذ یہ فیصلہ کرتا ہے

کہ زمین کس کی ہے اور کس کی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اصولی طور پر اس سے اتفاق کیا۔ اس طرح جب مذکورہ مسلمان نے جن سنگھی لیڈروں سے یہ اقرار کرالیا کہ زمین کا مسئلہ کاغذ کو دیکھ کر طے ہوتا ہے تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اب میں اس مسئلہ میں خود آپ لوگوں کو جج بناتا ہوں۔ میرے پاس جو کاغذات ہیں وہ میں آپ کو دے رہا ہوں۔ ٹھیکیدار صاحب کے پاس جو کاغذات ہیں وہ آپ ان سے لے لیں۔ اور دونوں کو لے کر اطمینان کے ساتھ گھر جائیں۔ تمام کاغذات کو دیکھ کر آپ خود فیصلہ دیدیں۔ اور میں پیشگی طور پر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ مجھ کو بلا شرط منظور ہوگا۔

اب جن سنگھی لیڈروں کا موڈ بدل گیا۔ ہندو ٹھیکیدار نے مذکورہ مسلمان کی جو تصویر بتائی تھی، عملی تجربہ میں انھوں نے ان کو اس سے بالکل مختلف پایا۔ جن سنگھی لیڈروں کی رہنما اب تک ہندو ٹھیکہ دار کی غلط رپورٹ تھی، اب ان کا رہنما ان کا وہ ضمیر بن گیا جو خدا نے ان کے سینہ کے اندر پیدا کیا تھا۔ چنانچہ وہ کاغذات کو لے کر دفتر سے باہر آئے اور ہجوم سے کہا کہ آپ لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ "میاں صاحب" نے فیصلہ خود ہمارے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ ہم سوچ کر اس معاملہ کا فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد جو ہوا وہ یہ کہ ان لوگوں نے کاغذات دیکھنے کے بعد مکمل طور پر مذکورہ مسلمان کے حق میں اپنا فیصلہ دیدیا۔

یہ واقعہ ۱۹۶۵ کا ہے اور اتر پردیش کے ایک شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے تمام اہم کردار آج بھی زندہ موجود ہیں۔ کوئی شخص تصدیق کرنا چاہے تو میں اس کو نام اور پتے دیدوں گا، وہ اصل مقام پر جا کر اس کی مکمل تصدیق حاصل کر سکتا ہے۔

حال میں بابری مسجد (اجودھیا) اور عیدگاہ (متھرا) وغیرہ کے مسائل پیدا ہوئے تو مجھ کو بار بار مذکورہ واقعہ یاد آتا رہا۔ خیال ہوا کہ کاش مسلمانوں کے لیڈر سنجیدہ اور حقیقت پسند ہوتے تو وہ اس طرح کے قومی مسائل میں بھی وہی تدبیر اختیار کرتے جو مذکورہ مسلمان نے اپنے ذاتی مسئلہ میں اختیار کی اور صد فی صد کامیابی حاصل کی۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یقینی طور پر یہ مسائل نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو جاتے۔ اور آئندہ کے لیے اس قسم کے نئے مسائل پیدا ہونے کا دروازہ بھی بند ہو جاتا۔

مگر مسلمانوں کے نادان لیڈروں کا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی اس طرح کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کو جوابی ہنگامہ آرائی کا عنوان بنالیتے ہیں ۔ پر جوش تقریریں کرنا اور سڑکوں پر جلوس اور نعروں کے مظاہرے کرنا، یہی آخری بات ہے جو ان کی عقل انھیں بتاتی ہے ۔ یہ طریق کار ممکن ہے کہ لیڈروں کی اپنی لیڈری کے لیے مفید ہو، مگر اصل مسئلہ کی نسبت سے وہ برعکس نتیجہ پیدا کرنے والا (counter-productive) ہے ۔ ایک مسئلہ جو ابتداءً محض چند مفاد پرست افراد کا مسئلہ تھا، مظاہراتی طریق کار اختیار کرنے کے بعد وہ قومی مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ وہ دونوں گروہوں کے لیے ساکھ (prestige) کا مسئلہ بن جاتا ہے ۔ ملک کے سیاسی حکمراں اگر کچھ کر سکتے تھے تو وہ بھی اب کرنے سے رک جاتے ہیں ۔ کیوں کہ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے کوئی انقلابی قدم اٹھایا تو اس کی انھیں یہ قیمت دینی پڑے گی کہ الکشن کے موقع پر وہ اس فرقہ کے ووٹوں سے محروم ہو جائیں جس کے خلاف انھوں نے اپنا فیصلہ دیا ہے ۔

اس کے برعکس اگر مسلمان لیڈر یہ کرتے کہ وہ سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ اعلیٰ سطح کے لوگوں سے ملاقات کرتے اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھتے کہ دونوں فرقوں کے باخبر اور قابلِ اعتماد افراد پر مشتمل کمیٹی بنائی جائے اور وہ تاریخی حقائق کا بے لاگ جائزہ لے کر فیصلہ کرے ۔ نیز جرأت مندانہ طریقہ اختیار کر کے وہ مذکورہ مسلمان کی طرح یہ بھی کہہ دیتے کہ کمیٹی جو فیصلہ کرے گی اس کو ہم بلاشرط مان لیں گے ۔ مسلمان لیڈر اگر یہ طریقہ اختیار کرتے تو یقینی طور پر مسئلہ اب تک ختم ہو چکا ہوتا ۔

اس رائے کا درست ہونا اس واقعہ سے بھی ثابت ہے کہ متعدد ہندو صاحبان نے اس معاملہ میں کھل کر اپنی قوم کے فرقہ پرستوں کی تردید کی ہے ۔ اور اس موضوع پر نہایت منصفانہ مضامین لکھے ہیں ۔ یہ مضامین نئی دنیا (دہلی) تعمیر حیات (لکھنؤ) نقیب (پٹنہ) اور دعوت (دہلی) وغیرہ میں نقل ہوئے ہیں ۔ ان اخبارات کی ۱۹۸۶ کی فائل میں ان مضامین کو دیکھا جا سکتا ہے ۔ اگر ان مضامین سے سبق لیا جائے تو وہ راقم الحروف کی تجویز کی معنویت ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں ۔

یہاں میں اس نوعیت کی صرف ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ یہ ایک مفصل خط ہے جو نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶) میں چھپا ہے۔ اس خط کے نیچے ۱۲ آدمیوں کے نام درج ہیں۔ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور ان میں سے ۱۱ افراد ہندو فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خط نہایت منصفانہ ہے۔ وہ اگلے صفحہ پر اصل الفاظ میں پورا نقل کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ ترین سطح کے ان ہندو دانشوروں نے اپنے خط میں سخت تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اخبار ٹائمس آف انڈیا اپنی خبروں اور اپنے ادارتی نوٹ کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہا ہے۔ اس کی ایک مثال متھرا کی عیدگاہ کے بارہ میں اس کی رپورٹ ہے جس کو " اورنگ زیب کے بعد کرشنا کی جائے پیدائش "کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ قدیم کیشو مندر کو راجہ بیر سنگھ دیو بندیلہ نے جہاں گیر کے زمانہ میں بنوایا تھا، اورنگ زیب نے اس مندر کو گرا کر عیدگاہ تعمیر کرائی۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس نے سیاسی بنیاد پر ایسا کیا۔ کیونکہ متھرا کے علاقہ میں بندیلہ اور جاٹ اس کے باغی ہو گیے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بے شمار دوسرے مندروں کو اورنگ زیب نے بالکل نہیں چھوا، حتیٰ کہ کئی نئے مندر اسی کے زمانہ میں بنوائے گیے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود یہ کیشو مندر بدھ مذہب کے عبادت خانہ کو توڑ کر بنایا گیا تھا۔

ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ یہ تاثر دیتی ہے کہ یہ مقام کرشنا کی جنم بھومی ہے۔ یہ بات اس وقت بہت عجیب معلوم ہوتی ہے جب اس حقیقت کو دھیان میں رکھا جائے کہ خود کرشنا کا وجود تاریخی طور پر مشتبہ ہے۔ یہی معاملہ اجودھیا کی رام جنم بھومی کا ہے۔ یہ بات جائزہ طلب ہے کہ کیا تاریخی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جگہ رام کی جائے پیدائش تھی۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ۱۹ ویں صدی تک یہاں ہندو اور مسلم کی جو نزاع تھی وہ خود بابری مسجد کے بارہ میں نہ تھی بلکہ مسجد سے الگ ایک اور جگہ کے بارے میں تھی جس کو ہنومان بیٹھک کہا جاتا تھا۔

ہندستان میں غیر رواداری کا مظاہرہ ہر مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے ہوتا رہا ہے

Communal Twist

Sir, — We have noted with growing concern a recent tendency in *The Times of India* to give a communal twist to news items and even to editorial comments. An example of this is a report from Mathura dated 15 September and entitled, "Krishna's Birthplace after Aurangzeb." It evoked considerable correspondence, some of which, as could be expected, was markedly communal in tone.

Your readers should know that historical analysis and interpretations involve more than a mere listing of dates with an eye to pious sentiments. The Dera Keshava Rai temple was built by Raja Bir Singh Deo Bundela during Jahangir's reign. This large temple soon became extremely popular and acquired considerable wealth. Aurangzeb had this temple destroyed, took the wealth as booty and built an Idgah on the site. His actions might have been politically motivated as well, for at the time when the temple was destroyed he faced problems with the Bundelas as well as Jat rebellions in the Mathura region. It should be remembered that many Hindu temples were untouched during Aurangzeb's reign and even some new ones built. Indeed, what is really required is an investigation into the theory that both the Dera Keshava Rai temple and the Idgah were built on the site of a Buddhist monastery which appears to have been destroyed.

Your news report also gives credence to the suggestion that this site was the birthplace of Krishna. This is extraordinary to say the least, when even the historicity of the personality is in question. It creates the kind of confusion such as has been created, probably deliberately, over the question of the birthplace of Rama in the matter of Rama-Janam-bhumi. A Persian text of the mid-nineteenth century states that the Babari mosque was adjacent to the Sita-ka-rasoi-ghar and was known as the Rasoi Sita mosque and adjoined the area associated with the birthplace of Rama. It would be worth enquiring whether there is reliable historical evidence of a period prior to the nineteenth century for this association of a precise location for the birthplace of Rama. Furthermore such disputes as there were between Hindus and Muslims in this area upto the nineteenth century were not over the Babari mosque but the totally different size of Hanuman-baithak.

It cannot be denied that acts of intolerance have been committed in India by followers of all religions. But these acts have to be understood in their context. It is a debasement of history to distort these events for present day communal propaganda.

The statement in your news report that the site at Mathura is to be "liberated" and handed over to the "rightful owners" as the birthplace of Krishna raises the question of the limits to the logic of restoration of religious sites (and this includes the demand for the restoration to worshippers of disused mosques now under the care of the Archaeological Survey of India). How far back do we go? Can we push this to the restoration of Buddhist and Jaina monuments destroyed by Hindus? Or of pre-Hindus animist shrines?

ROMILA THAPAR, MUZAFFAR ALAM, BIPAN CHANDRA, R. CHAMPAKA LAKSHMI, S. BHATTACHARYA, H. MUKHIA, SUVIRA JAISWAL, S. RATNAGAR, M.K. PALAT, SATISH SABERWAL, S. GOPAL, MRIDULA MUKHERJEE.

The Times of India, New Delhi, 21, Oct. 1986

مگر ان جھگڑوں کو ان کے سیاق میں رکھ کر دیکھنا چاہیے ۔ یہ تاریخ کی تلبیس ہوگی کہ ان چیزوں کو فرقہ وارانہ مقاصد کے لیے بگاڑ کر پیش کیا جائے ۔

ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ متھرا کے اس مقام کو دوبارہ حاصل کیا جائے اور اس کو اس کے اصل مالکوں کے حوالہ کیا جائے ۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس منطق کی حد کیا ہے اور اس کو آپ کتنے پیچھے تک لے جائیں گے ۔ کیا اس کو ہم یہاں تک لے جائیں گے کہ بدھوں اور جینیوں کے ڈھائے ہوئے مندروں کے مقامات دوبارہ انھیں لوٹائے جائیں اور کیا اسی طرح قدیم ہندستانی باشندوں کے چھینے ہوئے مقدس مقامات بھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶)

اوپر جو خط نقل کیا گیا ، یہ اول درجہ کے ہندو صاحبان کا خط ہے جو ملک کے اول درجہ کے انگریزی اخبار میں چھپا ہے ۔ یہ اعترافِ حق اس وقت ہے جب کہ ہم نے ابھی تک ہندو شخصیتوں کے ضمیر کو حکم نہیں بنایا ہے ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہندو شخصیتوں کے ضمیر کو حَکَم کے مقام پر بٹھا دیا جائے تو وہ کس قسم کا اور کیسا فیصلہ کریں گے ، بشرطیکہ سیاسی طریقہ اختیار کر کے مسئلہ کو قومی ساکھ کا مسئلہ نہ بنا دیا گیا ہو ۔

شیطان کی پیروی

روایات میں آتا ہے کہ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ مدینہ کی مسجد نبوی میں آئے تو دیکھا کہ صحابہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ ذکر کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اگرچہ اس بات کو بیان کرنے والے صحابہ کرام تھے اور یہ بات مسجد نبوی جیسے مقدس مقام پر بیان ہو رہی تھی، مگر حضرت عمرؓ نے اِس سے انکار کیا کہ وہ محض سُن کر اُس کو مان لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کے بارہ میں اس وقت تک کوئی رائے نہیں دے سکتا جب تک خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست دریافت نہ کرلوں۔

چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش گاہ پر آئے اور دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ آپ سے اجازت لے کر اندر داخل ہوئے اور مذکورہ خبر بیان کر کے اس کی اصل حقیقت دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، میں نے طلاق نہیں دی ہے۔ حضرت عمر اس کے بعد دوبارہ مسجد نبوی میں آئے اور اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں کو طلاق نہیں دی ہے۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری :

وَاِذَا جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

(النساء ۸۳)

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔

آج کل فساد یا فرقہ وارانہ خبروں کے معاملہ میں تمام مسلمان اس اسلامی تعلیم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق شاید چند مسلمان بھی اس ملک میں ایسے نہیں ہیں جو ہندو تعصب یا فرقہ وارانہ فساد کی کوئی خبر سنیں تو اس کی پوری طرح تحقیق کریں اور اس کے

تمام متعلقہ پہلوؤں کی جانچ کے بعد اپنی رائے قائم کریں۔ ہر ایک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ہندو یا حکومتی شعبوں کے بارے میں جو کچھ سنا اس کو مان لیا اور فوراً ہی اس کو پھیلانا شروع کر دیا۔

آج کل کسی بات کو پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ اخبارات ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کے اردو اخبارات کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ممنوعہ عمل کی ایجنسی بن گیے ہیں۔ مسلمانوں نے آج کل بے شمار اخبارات نکال رکھے ہیں، ان اخبارات کا مشترک کاروبار یہی ہے کہ ہندو۔ مسلم مسائل سے متعلق کوئی بات پا جائیں تو فوراً اس کو بڑھا چڑھا کر چھاپیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

صحابہ کرام سے تو اس قسم کی ایک معمولی لغزش محض وقتی طور پر ہوگئی تھی۔ اور تنبیہہ کے بعد وہ فوراً پلٹ آئے۔ مگر اس ملک کے مسلمان نصف صدی سے اسی قسم کی صحافت میں گم ہیں۔ صحافت کی اس قسم کو موجودہ زمانہ میں زرد صحافت (ایلو جرنلزم) کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اس زرد صحافت کو نہایت نفع بخش کاروبار سمجھ کر اختیار کر رکھا ہے۔ مگر انھیں جاننا چاہیے کہ یہ عین وہی جرم ہے جس کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت میں اتباع شیطان کہا گیا ہے۔

مذکورہ آیت میں کہا گیا ہے کہ جب کوئی اہم خبر ملے تو اس کو رسول کی طرف اور اصحابِ امر کی طرف لوٹاؤ۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ ایسی ہر خبر کو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی چھوڑی ہوئی سنت کی روشنی میں جانچنا چاہیے، اور اسی کی روشنی میں اس کے بارہ میں اپنا رویہ متعین کرنا چاہیے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس طرح کے امور میں وہ سنتِ رسولؐ کی پابندی کریں نہ یہ کہ قومی جذبات جدھر چلنے کا تقاضا کریں اسی طرف تمام لوگ چل پڑیں۔

دوسری چیز اصحاب امر کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس حکم کی تعمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ مسلمانوں کے درمیان "اصحاب امر" کا وجود ہو۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں۔ اگر با اختیار اصحاب امر موجود نہ ہوں تو رضا کارانہ بنیاد پر اپنے درمیان اصحاب امر کو وجود میں لائیں اور تمام اہم امور میں اسی اجتماعی ادارہ کے فیصلہ کی پیروی کریں نہ کہ اپنی انفرادی رائے کی۔

ذہنیت کا فرق

۴ نومبر ۱۹۸۷ کو لاہور میں پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان ریلائنس کپ کے لیے کرکٹ میچ تھا۔ اس میچ میں پاکستان کی ٹیم ہار گئی۔ یہ خبر بہت سے پاکستانیوں کے لیے اتنی سخت ثابت ہوئی کہ ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ حتی کہ بعض افراد اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے اور حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۸۷)

یہی بات ہندستان میں اس وقت پیش آئی جب کہ اگلے دن ۵ نومبر کو بمبئی میں انگلینڈ کے مقابلہ میں ہندستان کی ٹیم ہار گئی۔ ہندستان میں کسی کے حرکت قلب بند ہونے کی اطلاع تو نہیں آئی۔ البتہ ایک اور شکل میں یہاں بھی موتیں واقع ہوئیں۔ دونوں طرف کے پرستاروں کے درمیان ایک سے زیادہ مقامات پر ٹکراؤ ہو گیا۔ اور وہ ناخوش گوار چیز پیش آئی جس کو ہندستان ٹائمس (۶ نومبر ۱۹۸۷) نے بجا طور پر میچ فسادات (Match riots) کا نام دیا ہے۔

۹ نومبر کی ایک ملاقات میں اس کا ذکر مسٹر شکیل احمد خاں (پیدائش ۱۹۴۰) سے ہوا۔ انھوں نے انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے، اور آج کل عرب امارات کی ایک فرم میں چیف انجینیر ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس معاملہ میں میرا طریقہ بالکل الگ ہے۔ میں کبھی شکست کے احساس سے دوچار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جیتنے والی ٹیم کو میں اپنی ٹیم سمجھتا ہوں:

I never lose, winning team is my team.

یہی وہ چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں اسپورٹس مین شپ (Sportsmanship) کہا جاتا ہے۔ باعتبار مفہوم اس کو ہنر پسندی کہہ سکتے ہیں۔ یہ صحت مند ذہن کی علامت ہے۔ اس ذہن کے مطابق اصل چیز کھیل ہے نہ کہ کھیلنے والا۔ صحیح اسپورٹسمین اسپرٹ یہ ہے کہ آدمی کی نگاہ ہنر پر ہو۔ وہ یہ دیکھے کہ کھیل کیسا کھیلا گیا، نہ یہ کہ کون شخص کھیلا۔

۱۹۴۷ کے "انقلاب" کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان میں اس صحت مند مزاج کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ ہنرمندی سے محظوظ نہیں ہو پاتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جیتنے والا کون ہے اور ہارنے والا کون۔ اپنی قوم کا آدمی جیتے تو وہ خوشی مناتے

ہیں، اور اگر اتفاق سے دوسری قوم کا آدمی جیت جائے تو غم سے نڈھال ہوجاتے ہیں۔
یہ صحت مند ذہنیت نہیں، یہ مریضانہ ذہنیت ہے۔ جن لوگوں کا یہ مزاج ہو وہ کبھی کوئی اعلیٰ کامیابی حاصل نہیں کرسکتے۔ ان کے اندر قومی خودغرضی تو خوب ترقی کرے گی، مگر ان کے درمیان سائنٹفک مزاج کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ وہ مزاج جس کا ایک نمونہ موجودہ زمانہ میں جاپان نے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی قوم پسند یا فرقہ پسند نہ ہو بلکہ وہ معیار پسند ہو۔ جن لوگوں کے اندر یہ صفت ہو، وہ جب کوئی کام کرتے ہیں تو ان کی ساری توجہ معیار (Quality) پر ہوتی ہے۔ وہ اپنا کام اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے بارے میں وہ اعلیٰ معیار سے کم تر کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے۔

جاپانیوں کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنی مصنوعات کو نقص بدرجہ صفر (Zero-defect) کے درجہ تک پہونچا سکیں۔ اور اپنے بڑھے ہوئے معیار کی بنا پر ساری دنیا کی مارکیٹ پر قبضہ کرلیں۔

اسرائیل کے قیام سے پہلے کی بات ہے، ایک مسلم پہلوان اور ایک یہودی پہلوان میں کُشتی کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں مسلمان کامیاب رہا۔ اس نے یہودی پہلوان کو منٹوں کے اندر گرادیا۔ بظاہر یہودی پہلوان کے لیے یہ بڑی ذلت کی بات تھی۔ مگر اس نے فوراً اٹھ کر مسلم پہلوان کو گلے سے لگا لیا۔ اس نے کہا: میں تمہاری ذات کی نہیں بلکہ تمہارے فن کی قدر کرتا ہوں۔ تم نے جس فن کاری کے ساتھ مجھے گرایا ہے وہ اتنا اعلیٰ ہے کہ میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

کسی قوم میں اسپورٹسمین اسپرٹ کا ہونا یا نہ ہونا کوئی جزئی بات نہیں۔ اس کا تعلق اس قوم کے پورے کردار سے ہے۔ اس کا ظہور زندگی کے تمام معاملات میں ہوتا ہے۔ ایک نوعیت کا ذہن آدمی کو اپنے حریف سے صرف نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ حریف کی خوبیاں بھی اس کو برائی کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ یہ چیز اس کو ہر اعتبار سے پست کردار بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا مزاج آدمی کو معیار پسند بناتا ہے اس سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا انسان ابھرتا ہے جس کے لیے دشمن کا عمل بھی مفید سبق حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

ہم کو فائدہ ہے

ہندستان کے ایک مسلمان لیڈر سے ملاقات ہوئی۔ وہ اردو کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالتے ہیں۔ ابتداءً ان کا اخبار عرصہ تک خسارہ پر چلتا رہا۔ مگر اب وہ نفع پر چل رہا ہے۔

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جب اپنا اخبار نکالا تو کوشش کے باوجود اس کی اشاعت کسی طرح تین ہزار سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ اسی حالت میں لمبی مدت گزر گئی۔ انھوں نے ہر قسم کی تدبیریں کر ڈالیں مگر اخبار کی اشاعت نہیں بڑھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ میں اجودھیا کی مسجد کا معاملہ پیش آیا جو مسلمانوں کے نزدیک "بابری مسجد" ہے مگر ہندوؤں کا دعوی ہے کہ وہ "رام جنم بھومی" ہے۔ مذکورہ لیڈر نے فوراً اس کو پکڑ لیا۔ انھوں نے اس موضوع پر مسلسل دھواں دھار مضامین شائع کیے، اور ان پر تیز و تند سرخیاں قائم کیں۔ نتیجہ عین اندازے کے مطابق نکلا۔ ان کے اخبار کی اشاعت اچانک تین ہزار سے بڑھ کر تیس ہزار تک پہونچ گئی۔ ان کے پاس ہر طرف سے تحسین اور مبارک باد کے خطوط آنے لگے۔

بابری مسجد جیسے واقعات مسلم ملت کے لیے بری خبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ مسلم قیادت کے لیے اچھی خبر بن جاتے ہیں۔ وہ ایک کے لیے المیہ ہیں اور دوسرے کے لیے طربیہ —— یہ کہانی محض ایک صحافی لیڈر کی کہانی نہیں، یہی ہماری تمام قیادت اور صحافت کی کہانی ہے۔

مذکورہ روداد سن کر مجھے ایک صاحب کا قصہ یاد آگیا۔ وہ ایک دیہاتی مسلمان تھے۔ وہ اکثر قبروں اور درگاہوں پر جاتے اور وہاں مرادیں مانگتے۔ بستی کے ایک عالم نے ان کو اس سے منع کیا اور کہا کہ قبروں سے مرادیں مانگنا شرک ہے۔ عالم کے نزدیک اس قسم کا فعل شرک تھا۔ مگر مذکورہ دیہاتی مسلمان کا "تجربہ" تھا کہ وہ صاحب قبر سے جو مراد مانگتا ہے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس نے لڑکا مانگا تو اس کے یہاں لڑکا پیدا ہو گیا۔ چنانچہ عالم کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، اس نے چلا کر کہا :

ہم تو جائیں گے، ہم کو فائدہ ہے

راقم الحروف پچھلے بیس سال سے مسلم رہنماؤں کو مشورہ دے رہا ہے کہ وہ جذباتی

سیاست کا طریقہ چھوڑ دیں اور خاموش تعمیر کا طریقہ اختیار کریں۔ اس کے لیے میں نے اکابرِ ملت سے ملاقاتیں کیں۔ ان سے خط و کتابت کی۔ تحریروں کے ذریعہ مسلسل انھیں متوجہ کیا۔ اور دلائل اور مثالوں سے اس کو اس حد تک واضح کر دیا کہ کسی کے پاس اس کی تردید میں کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ اس کے باوجود کوئی مسلم رہنما اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں بھی اصل سبب وہی ہے جس کا نمونہ دیہاتی مسلمان کے واقعہ میں نظر آتا ہے۔ ہر رہنما گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے :

ہم جذباتی سیاست چلائیں گے، اس سے ہم کو فائدہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی صحافت اور قیادت دونوں فسادات کے اوپر قائم ہیں۔ اس ملک میں اگر فرقہ وارانہ فسادات ختم ہو جائیں تو اسی کے ساتھ اس ملک کی مسلم صحافت اور مسلم قیادت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اردو کے ایک تجربہ کار صحافی جناب ساجد رشید نے اسی بات کو ان الفاظ میں لکھا ہے :

"اردو کے بیشتر اخبارات کا محبوب موضوع فساد ہے، اور وہ بھی صرف ہندو مسلم فساد۔ اردو اخبارات فساد کی خوفناک خبروں کے بغیر نیا شمارہ چھاپنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ ایک ہفت روزہ اخبار کے نوجوان مدیر نے ایک بار مجھ سے کہا: "بھائی، کہیں پر ایک آدھ فساد ہو جائے تو اخبار کی اشاعت بڑھ جائے۔" بیشتر اردو صحافی آج اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ کسی بھی اردو ہفت روزہ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، وہ مسلمانوں کی کچھ ایسی تصویر کشی کرے گا گویا اس سے زیادہ مظلوم قوم کوئی دوسری نہیں۔ اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ مسلمان اس دیس کی فرقہ وارانہ آگ کا ایندھن ہیں۔ لیکن اردو کے صحافی اس کو جس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں، اس سے مسلمانوں پر منفی اثرات مترتب ہو رہے ہیں۔ مسلمان خود کو بے حد مظلوم اور غیر محفوظ محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس قسم کا جذبہ آدمی کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کو اس بری طرح متاثر کرتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس منطق سے غور کریں تو پتہ چلے گا کہ بیشتر اردو اخبارات ایک پوری قوم کو مفلوج کرنے کی خطرناک سازش میں غیر محسوس طریقہ سے ملوث ہیں۔" (روزنامہ اردو ٹائمز، بمبئی، ۱۴ ستمبر ۱۹۸۶)

ایک تجربہ

۱۹۶۶ کی بات ہے۔ اس وقت میں ندوہ (لکھنؤ) میں تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ پولیس کی گاڑی ندوہ کے احاطہ میں آکر رکی۔ اس میں سے کئی پولیس کے لوگ برآمد ہوئے۔ ان کو ندوہ کے ذمہ داروں نے ٹیلی فون کرکے بلایا تھا تاکہ وہ ان کے ایک سنگین مسئلہ کو حل کریں۔

مسئلہ یہ تھا کہ ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی دونوں بالکل پاس پاس ہیں۔ یونیورسٹی کا ایک ہاسٹل ندوہ کی دیوار سے ملا ہوا ہے۔ اس ہاسٹل کے لڑکے جو سب کے سب غیر مسلم تھے ندوہ والوں کو مسلسل پریشان کررہے تھے۔ وہ گالی دیتے، پتھر پھینکتے، مذاق اڑاتے اور طرح طرح کی نازیبا حرکتیں کرتے۔ ان کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ندوہ کے لوگ مشتعل ہوکر کوئی جارحانہ کارروائی کریں اور پھر یونیورسٹی کے لڑکوں کو ندوہ کے خلاف بھرپور فساد کرنے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔

یہ مسئلہ برسوں سے جاری تھا۔ ندوہ والوں نے پریشان ہوکر پولیس بلائی اور ان سے فریاد کی۔ پولیس والے حسب دستور رسمی کارروائی کرکے واپس چلے گئے۔ اور اصل مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔

یہ مسئلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۷۴ میں ندوہ کے ذمہ داروں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ مسئلہ نہ پولیس کے ذریعہ حل ہوسکتا ہے اور نہ براہ راست ٹکراؤ کے ذریعہ اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس کو تالیف قلب کے اسلامی اصول کو استعمال کرکے حل کیا جائے۔ اس فیصلہ کے تحت مولانا علی میاں کے رفیق خاص مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم اس کے ذمہ دار بنائے گئے۔

منصوبہ کے مطابق مولانا اسحاق جلیس ندوی نے پہلے یہ پتہ لگایا کہ ہاسٹل کے لڑکوں میں لیڈر کون کون ہے۔ انھوں نے ان لیڈروں سے ملاقات کی۔ ان کو ندوہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ چلئے پر بلایا گیا۔ ندوہ والوں نے ان "ظالم" لڑکوں سے ان کے ظلم اور بدتمیزی کے بارہ میں ایک لفظ نہیں کہا۔ ان سے ساری ملاقات اور گفتگو اس طرح کی گئی جیسے کہ ندوہ والوں کو ان سے کوئی شکایت ہی نہیں۔ پوری مدت میں ندوہ کے لوگ ان سے اس طرح معتدل انداز میں ملتے رہے جیسے کہ ان کی طرف سے ظلم وزیادتی کا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔

ان گفتگوؤں اور ملاقاتوں کے نتیجہ میں، عین پیشگی منصوبہ کے مطابق، یہ ہوا کہ ندوہ کی ٹیم اور

یونیورسٹی کی ٹیم کے درمیان ہاکی میچ رکھا گیا۔ ندوہ کے لڑکے ہاکی کھیلنے میں مشہور ہیں۔ مگر انھیں پیشگی طور پر یہ سمجھا دیا گیا کہ تمہیں اس میچ میں جیتنا نہیں ہے۔ تم کو جان بوجھ کر خراب کھیل کھیلنا ہے تاکہ تم ہار جاؤ۔ منصوبہ یہ تھا کہ جان بوجھ کر یونیورسٹی کے لڑکوں کو کھیل میں جتایا جائے اور پھر انھیں ہیرو بنا کر ان کے دل کو جیتنے کی کوشش کی جائے۔

مقررہ تاریخ کو دونوں کے درمیان ہاکی میچ ہوا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ندوہ کے نوجوان خراب کھیل کھیلے اور یونیورسٹی کے لڑکوں کو بالقصد یہ موقع دیا کہ وہ بہتر کھیل کر میچ جیتیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ یونیورسٹی کے طلبہ ندوہ کے طلبہ کے مقابلہ میں "شاندار طور پر" کامیاب ہوگیے۔ اب طے شدہ منصوبہ کے مطابق یونیورسٹی کے لڑکوں کو خوب اچھالا گیا۔ مختلف طریقوں سے ان کی تالیف قلب کی گئی۔ ان کو دل کھول کر انعامات دیے گیے۔ ان کا ہیروانہ استقبال کیا گیا۔ وغیرہ

یونیورسٹی کے طلبہ ندوہ والوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی چاہتے تھے اور ندوہ والوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو چھوٹا کر ان کی بڑائی کا اعتراف کرلیا۔ ندوہ کے لوگوں نے اپنے مذکورہ عمل سے یونیورسٹی کے طلبہ کے جذباتِ برتری کو پوری طرح تسکین دے دی۔ اب مسئلہ اپنے آپ حل تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نے اس کے بعد پھر کبھی ندوہ والوں کو پریشان نہیں کیا۔

یہ ایک عظیم الشان مثال ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا حل کیا ہے وہ حل یہ ہے کہ مسلمان یک طرفہ اقدام کے ذریعہ ہندو مسلم تناؤ کو ختم کردیں۔ وہ خود "چھوٹے بھائی" بن کر فریق ثانی کو "بڑے بھائی" کا درجہ دینے پر راضی ہو جائیں اور اس کے بعد ان کے تمام مسئلے یقینی طور پر حل ہو جائیں گے۔

ندوہ کا مذکورہ واقعہ مزید اس جھوٹے اندیشہ کو غلط ثابت کرتا ہے کہ اگر ہم جھکیں گے تو وہ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ مذکورہ واقعہ میں ندوہ والوں نے واضح طور پر یک طرفہ جھکاؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے غیر مسلم طلبہ کی ہمتیں اور زیادہ بڑھ جائیں۔ وہ پہلے سے زیادہ جری ہو کر ندوہ والوں کو ستانے لگیں۔ ندوہ والوں کا نرم رویہ ان کو اور زیادہ سخت رویہ دالا بنادے۔ مگر ایسا قطعاً نہیں ہوا بلکہ ندوہ والوں کے جھکاؤ نے انھیں بھی جھکا دیا۔ ایک فریق کی نرمی دوسرے فریق کو نرم کرنے کا سبب بن گئی۔ جو مسئلہ دس سال سے ناقابلِ حل بنا ہوا تھا،

وہ ایک دن کے اندر لڑے بھڑے بغیر حل ہو گیا۔ ۱۹۷۴ کے بعد وہ دوبارہ کبھی پیش نہیں آیا۔

ندوہ کے اس چھوٹے سے واقعہ میں اس عظیم تر مسئلہ کے بارہ میں رہنمائی موجود ہے جس کو عام طور پر ملی مسئلہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ عملی تجربہ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ملک کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ندوہ والوں نے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اپنے محدود دائرہ میں جو تدبیر کی وہی تدبیر وسیع تر دائرہ میں ملت کے مسائل کا بھی واحد یقینی حل ہے۔ اگر مسلمان اس دانش مندی کا ثبوت دیں، جس کا ثبوت ندوہ والوں نے دیا تو یقینی طور پر ان کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ امن اور یکسوئی کے ماحول میں اپنی تعمیر و ترقی کا کام کر سکیں۔ اس کے بعد وہ تعمیر کے کام کے لیے بھی مواقع پالیں گے اور اسلام کی اشاعت کے کام کے لیے بھی۔

مسئلہ کے حل کا جو تجربہ دس سال پہلے ندوہ میں کامیاب طور پر کیا گیا تھا، وہ ندوہ کے باہر ملت کے وسیع تر دائرہ میں کیوں اب تک اختیار نہ کیا جا سکا۔ اس کا سبب متناقض طور پر (Paradoxically) خود ندوہ کے ذمہ دار اور ان کے جیسے دوسرے قائدین ہیں۔ اس المیہ کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ان قائدین ملت نے اس حدیث رسول پر عمل نہیں کیا جس میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم دوسروں کے لیے بھی وہی چیز پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو (احبّ للنّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِكَ) ؎

ان قائدین نے جس تدبیر سے اپنا ذاتی مسئلہ کامیاب طور پر حل کیا، ان پر لازم تھا کہ دوسروں کو بھی وہ وہی تدبیر بتائیں۔ وہ ساری مسلم قوم کو اسی آزمودہ طریق کار کا سبق دیں۔ مگر انھوں نے نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں کیا بلکہ وہ ملت کو اس کے برعکس تدبیر اختیار کرنے پر ابھارتے رہے۔ اپنا مسئلہ انھوں نے خاموش تدبیر سے حل کیا تھا اور قوم کو وہ پر شور تدبیر اختیار کرنے کا سبق دیتے رہے۔ اپنا مسئلہ انھوں نے مفاہمت کے ذریعہ حل کیا تھا اور ملت کو انھوں نے مقابلہ آرائی کا پیغام دیا۔ اپنے لیے انھوں نے شکست کو مان کر جینے کا راز دریافت کیا تھا اور دوسروں کو وہ اپنی تقریروں میں للکارتے رہے کہ

؎ یہ ایک مشہور حدیث ہے جو مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ، رواہ البخاری ومسلم

ہرگز شکست نہ ماننا، چاہے تم سب کے سب ہلاک ہو جاؤ۔ اپنے ذاتی حریف کو پیش کرنے کے لیے ان کے پاس تالیف قلب کا گلدستہ تھا۔ مگر جب وہ قوم کے سامنے آئے تو اس کو یہ کہہ کر ابھارا کہ تم سیف اللہ اور صمصام الاسلام بن کر اپنے حریف کا مقابلہ کرو۔ تقریر و خطابت کے لیے ان کے پاس دوسرا اسلام تھا اور عمل کے لیے بالکل دوسرا اسلام۔

قائدین کا یہی تضاد ملت کے تمام مسائل کا واحد سبب ہے۔ ہمارے قائدین اپنے ذاتی مسائل کو مفاہمت اور خوش تدبیری کے ذریعہ حل کر رہے ہیں۔ اور ملت کے نوجوانوں کو اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ لامتناہی طور پر اپنے حریفوں سے لڑتے رہیں۔ اسی تضاد کا یہ کرشمہ ہے کہ ہمارے قائدین خود تو ہر قسم کے جانی اور مالی نقصان سے بچے ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کو کبھی کوئی زخم نہیں لگا۔ اور ملت کا حال یہ ہے کہ وہ بے فائدہ طور پر اپنا جان بھی برباد کر رہی ہے اور اپنا مال بھی۔ اگر اسلام کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ مجنونانہ اقدام کر کے اپنے مکانوں اور دکانوں کو نذر آتش کرایا جائے تو محترم قائدین کے مکان اور دکان کیوں نذر آتش نہیں ہوتے۔ اگر اسلام کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی مشتعل ہو کر لڑے اور شہید ہو جائے تو خود قائدین اپنے آپ کو اس فضل شہادت سے کیوں محروم کیے ہوئے ہیں۔

ندوہ سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکلتا ہے جس کا نام ہے 'تعمیر حیات'۔ اس کی اشاعت ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ میں ندوہ کے ذمہ دار اعلیٰ کا ایک خصوصی انٹرویو چھپا ہے۔ اس کا جلی عنوان یہ ہے:

مسلمانوں کو اس ملک میں اپنا وزن ثابت کرنا ہوگا۔

اس انٹرویو میں ندوہ کے مذکورہ ذمہ دار نے فرمایا کہ "کسی قوم یا فرقہ کا وزن اس وقت محسوس کیا جاتا ہے جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ نفع کے علاوہ نقصان بھی پہونچا سکتا ہے۔"

ندوہ کے مذکورہ ذمہ دار پچھلے بیس سال سے ہندستان کے "مظلوم" مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنے مسئلہ کے حل کے لیے نقصان رسانی کی اہلیت کا ثبوت دو۔ یہی مشورہ انھوں نے ۱۹۶۷ کے ہندستانی الکشن میں مسلمانوں کو دیا تھا۔ مذکورہ انٹرویو کے مطابق اب بھی وہ قوم کو یہی مشورہ دے رہے ہیں۔ "مفکر اسلام" کا یہ قیمتی مشورہ نعوذ باللہ خود پیغمبر اسلام کو بھی معلوم نہ تھا۔ ورنہ وہ مکہ کے مظلوم مسلمانوں کو حبش یا یثرب کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ نہ دیتے بلکہ یہ کہتے کہ قریش مکہ کو نقصان پہونچا کر تم اپنے لیے مکہ میں زندگی کا حق وصول کرو۔

عجیب بات یہ ہے کہ مذکورہ بزرگ نے خود اپنے ادارہ کے مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ ادارہ کے لوگ اپنے حریف کے مقابلہ میں بالکل بے ضرر بن جائیں۔ وہ یک طرفہ طور پر جھک کر فریق ثانی کی برتری تسلیم کرلیں مگر ملت کو وہ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم میدانِ مقابلہ میں ڈٹ جاؤ۔ تم اپنے حریف کو ضرر پہونچاؤ تم فریق ثانی کو جھکنے پر مجبور کردو۔ یہ تضاد بھی کیسا عجیب ہے کہ ایک انسان اپنے ذاتی معاملہ میں یک طرفہ طور پر فریقِ ثانی کے آگے جھک کر اپنے مسئلہ کو حل کرتا ہے اور ملت کو وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ تم اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود فریقِ ثانی کو جھکاؤ اور اس کو نقصان پہونچا کر اپنے مسئلہ کو حل کرو۔

مسئلہ کے حقیقی حل کے لیے اکثر آدمی کو اپنی بڑائی کے بت کو توڑنا پڑتا ہے۔ مذکورہ مثال میں ندوہ والوں نے یونیورسٹی والوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کو توڑا، اسی وقت یہ ممکن ہوا کہ مسئلہ کے حل کی راہیں کھلیں۔ ذاتی معاملہ میں چوں کہ آدمی سنجیدہ ہوتا ہے، وہ فوراً اپنی ذاتی بڑائی کے بت کو توڑنے پر راضی ہوجاتا ہے۔ وہ مسئلہ کے حل کو اصل قرار دیتا ہے نہ کہ اپنی ذات کی بڑائی کو۔ مگر ملت کے معاملہ میں لوگ اتنا سنجیدہ نہیں جتنا وہ ذاتی مفاد کے معاملہ میں سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں وہ اپنی بڑائی کے بت کو نہیں توڑتے۔ ذاتی مفاد کے معاملہ میں ہر شخص اپنی بڑائی کو توڑے ہوئے ہے مگر ملت کے مفاد کے معاملہ میں کوئی شخص اپنی بڑائی کو توڑنے پر راضی نہیں۔

مذکورہ انٹرویو میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "اخلاقی قیادت کرکے مسلمان ہندستان کی ناگزیر ضرورت بن سکتے ہیں" یہ بات بذاتِ خود صحیح ہے۔ مگر اپنی موجودہ شکل میں وہ سراسر ناکافی ہے۔ ندوہ کے مذکورہ بزرگ کو اپنے اس مشورہ کے ساتھ اپنا ۱۹۷۴ کا تجربہ بھی بتانا چاہیے۔ انھیں اسی کے ساتھ اس کا بھی اعلان کرنا چاہیے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے غیر مسلم طلبہ کے مقابلہ میں انھوں نے کس تدبیر کے ذریعہ اخلاقی فتح حاصل کی تھی۔

وہ تدبیر ایک لفظ میں یک طرفہ جھکاؤ تھی۔ انھوں نے یونیورسٹی کے طلبہ کے مقابلہ میں یک طرفہ طور پر ہار قبول کی۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو چھوٹا بنایا۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو نرم رویہ کا پابند کیا۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ اپنے آپ کو مقابلہ آرائی کے مقام سے ہٹائیں۔ ندوہ والوں کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو اخلاقی قیادت کا درس دینے کے ساتھ یہ بھی ضرور بتائیں کہ اس کا راز یک طرفہ جھکاؤ ہے اور اس کا کامیاب تجربہ وہ خود ۱۹۷۴ میں کرچکے ہیں۔

چند مثالیں

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کو ہمارے لیڈر "مسلم کش فسادات" کہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بعض ہندوؤں کی بعض مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں ہے بلکہ یہ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی نسل کشی ہے۔ مگر اس واقعہ کا سب سے زیادہ حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ اس عمومی مسلم کشی سے مسلم لیڈر صاحبان ہمیشہ مکمل طور پر محفوظ رہتے ہیں، خواہ وہ بے ریش لیڈر ہوں یا باریش لیڈر۔ ایک مسلم اخبار نے بالکل درست طور پر لکھا ہے :

"اس (فساد) میں قصور عام لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کے آرام پسند لیڈروں کا ہے جو مسلمانوں سے قربانی و ایثار کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن ان میں قربانی دینے کا کوئی حوصلہ نہیں ہے۔ چالیس برسوں کے دوران مسلمانوں کو جو قربانی دینی پڑی یا زبردستی ان سے جو قربانی وصول کی گئی اس کی مثال شاید ہی دنیا کی دوسری کوئی ملت پیش کر سکے۔ لیکن ان چالیس برسوں میں ایک بھی مسلمان لیڈر کو خراش تک نہیں آئی"۔ نقیب (پٹنہ) ۲۰ جولائی ۱۹۸۷

مسلم لیڈروں کے اپنے بیان کے مطابق اس ملک میں تقریباً نصف صدی سے مسلم کشی اور مسلمانوں کے قتل عام کے واقعات ہو رہے ہیں۔ مگر بے ریش اور باریش مسلم لیڈروں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جو ہلاکت اور بربادی کے اس عمومی طوفان کا شکار ہوا ہو۔ اس قتل عام میں فرزندانِ ملت تو مسلسل ذبح ہو رہے ہیں، مگر فرزندانِ قیادت پوری طرح محفوظ ہیں۔

اس تجربہ کی روشنی میں میں مسلمانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس پورے معاملہ پر از سر نو غور کریں۔ کیوں کہ اس تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر ہلاکت خیز فسادات کے باوجود یہاں ایک مجرب نسخہ ان کے لیے موجود ہے۔ وہ خود بھی وہی کریں جو ان کے لیڈر نصف صدی سے کر رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر جس تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو مسلم کش فسادات کی زد سے بچائے ہوئے ہیں اسی تدبیر کے ذریعہ عام مسلمان بھی اس وبا سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اس معاملہ میں اپنے بچاؤ کا اس سے زیادہ کارگر نسخہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اب دیکھئے کہ مسلمان لیڈر صاحبان کس طرح اپنے آپ کو مسلم کش فسادات کی زد سے بچائے

ہوئے ہیں۔ ایک لفظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام لیڈر صاحبان اپنی ذات کے معاملہ میں عین اسی طریقے پر عمل کرتے ہیں جس کی تلقین الرسالہ میں مسلسل طور پر کی جارہی ہے۔ البتہ جب وہ دوسروں کے سامنے آتے ہیں تو وہ اس کے برعکس تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ اسٹیج پر وہ الرسالہ کے مخالف ہیں، مگر اپنی ذاتی زندگی کے معاملہ میں وہ الرسالہ کی بات کو مبالغہ آمیز حد تک پکڑے ہوئے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے یہودی پیشواؤں کے بارے میں اپنے شاگردوں سے کہا تھا : فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدّی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیوں کہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ ان کو اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ (متی ۲۳ : ۱-۳)

موجودہ حالات میں ہمارے لیڈر اور رہنما جو کچھ کر رہے ہیں وہ برعکس طور پر ہمارے لیے مطلوب ہو گیا ہے۔ ہندو مسلم مسئلہ کے ضمن میں یہ لیڈر عام مسلمانوں کو ٹکراؤ کا سبق دیتے ہیں، مگر خود اپنی ذات اور اپنی اولاد کے معاملے میں وہ ہم آہنگی کے طریقہ پر عمل کر رہے ہیں۔ اس لیے میں حضرت مسیح کے الفاظ کو بدل کر مسلمانوں سے کہوں گا کہ تمہارے لیڈر اس معاملہ میں جو باتیں کہتے ہیں ان کو نہ سنو، البتہ وہ خود جس طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں اسی کو تم بھی اپنالو۔ اور پھر تم بھی اسی طرح محفوظ رہو گے جس طرح تمہارے تمام لیڈر محفوظ ہیں۔

چند مثالیں

ایک مسلمان لیڈر سے راقم الحروف کی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ الرسالہ کے ذریعہ مسلمانوں کو بزدلی کا سبق دے رہے ہیں۔ حالاں کہ پیغمبر اسلام کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اسلام دشمنوں سے جنگ کی۔ انھوں نے ہمیشہ اسلام دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ لیڈر کے اصل الفاظ یہ تھے :

He always took up arms against the enemies of Islam.

میں نے کہا کہ آج کل ساری دنیا میں جہاد کے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ مسلمانوں اور "دشمنانِ اسلام" کے درمیان لڑائی جاری ہے۔ آپ ہتھیار خریدیئے اور کسی جگہ کا انتخاب کر کے میدانِ

جہاد میں کود پڑیے"۔ اب ان کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا رہا ہوں تاکہ وہ ڈاکٹر اور انجینئر بن کر قوم کی خدمت کریں۔ کیا یہ جہاد نہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مسلمان لیڈروں کے فسادات سے محفوظ رہنے کا ایک راز یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کے سامنے پرجوش تقریریں کرکے انھیں لڑائی کے میدان میں بھیج رہے ہیں اور خود اپنے بچوں کو اس قسم کے جھگڑوں سے دور رکھ کر تعلیم کے میدان میں مصروف کیے ہوئے ہیں۔ اب عام مسلمانوں کو بھی یہی کرنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو پرامن "جہاد" کے میدان میں لگادیں۔ اس کے بعد وہ بھی اسی طرح فسادات کی زد سے محفوظ رہیں گے جس طرح ان کے لیڈر اور لیڈر صاحبان کے بیٹے بیٹیاں محفوظ ہیں۔

ہمارے تمام لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ عمل کے بزدل ہیں اور الفاظ کے بہادر۔ اس پالیسی سے ان کو یہ زبردست فائدہ ہو رہا ہے کہ "قتل عام" کے ماحول میں بھی وہ اور ان کے گھر والے قتل ہونے سے پوری طرح بچے ہوئے ہیں۔ پھر کیوں نہ عام مسلمان بھی اسی پالیسی کو اختیار کرلیں۔ ایسا کرکے وہ صرف اپنے لیڈروں کی پیروی کریں گے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

۲۔ اس سلسلے میں ایک بے حد سبق آموز مثال وہ ہے جو راقم الحروف نے اپنی کتاب (حل یہاں ہے) میں درج کی ہے۔ یہ مثال تفصیلی صورت میں کتاب کے صفحہ ۴۲-۴۵ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

مسلم لیڈر صاحبان کی ایک جماعت ۶۷ - ۱۹۶۶ کے درمیان بڑے جوش و خروش کے ساتھ اٹھی۔ اس تحریک کا مرکز شمالی ہند تھا۔ انھوں نے مسلم مسائل کے حل کا وہ نسخہ پیش کیا جس کو اقبال نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

انھوں نے کہا کہ ہمیں لڑکر اپنا حق وصول کرنا ہے۔ اس "لڑائی" کا پہلا میدان ملکی انتخاب قرار پایا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں کانگریس (بالفاظ دیگر ہندو قیادت) کو انتخابی میدان میں شکست دینا ہے۔ ہم جب اس طرح اپنی قوت کا مظاہرہ کریں گے تو تمام لیڈر سہم جائیں گے اور اپنے آپ کو امکانی سیاسی نقصان سے بچانے کے لیے ہمارے تمام مسائل حل کر دیں گے۔

۱۹۶۷ کے الکشن میں ضرر رسانی کے اس نسخہ کا تجربہ کیا گیا مگر یہ نسخہ مسلمانوں کے لیے ایک

فی صد بھی مفید ثابت نہ ہو سکا۔ تاہم لیڈروں کی اس جماعت نے خود اپنے مسئلہ کے لیے جو نسخہ استعمال کیا وہ انتہائی کارگر ثابت ہوا۔ یہ نسخہ کسی شاعر کے کلام سے لینے کے بجائے قرآن سے لیا گیا تھا۔ یہ نسخہ وہی تھا جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے۔

لیڈروں کی اس جماعت کو ایک ہمسایہ یونیورسٹی کے ہندو طلبہ سے خطرہ پیدا ہوا۔ یہاں انھوں نے ضرر رسانی کے بجائے نفع رسانی کی تدبیر استعمال کی۔ انھوں نے ان ہندو طلبہ سے ملاقاتیں کیں، اپنے یہاں ان کی دعوتیں کیں، ان کو ہیرو بنا کر انھیں انعامات دیئے۔ اس طرح ان کے دل کو جیت کر اپنے مسئلہ کو حل کر لیا۔ اس پورے واقعہ کی تفصیل "حل یہاں ہے" نامی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اب میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دوں گا کہ مسلمان لیڈر اگر ٹکراؤ کی باتیں کریں تو ان کی بات بالکل نہ سنو بلکہ وہی کرو جو وہ خود کرتے ہیں۔ یعنی اپنے غیر مسلم پڑوسیوں سے اچھے تعلقات بناؤ۔ ان سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آؤ، ان کے لیے نفع بخش بننے کی کوشش کرو۔ ان سے تمہیں ناخوش گواری کا تجربہ ہو تب بھی تم اپنی طرف سے ان کے سامنے خوش گوار ردعمل پیش کرو، اور اس کے بعد تمہارے مسائل اسی طرح حل ہو جائیں گے جس طرح لیڈر صاحبان کے مسائل حل ہو گیے۔

۳۔ ایک صاحب نے بتایا کہ شمالی ہند کے ایک مقام پر مسلمانوں کا ایک جلسہ تھا، میں بھی اس میں شریک تھا۔ ایک باریش مسلمان لیڈر نے تقریر کی۔ انھوں نے جوش و خروش کے ساتھ بابری مسجد کا ذکر کیا اور کہا کہ "بابری مسجد خون مانگ رہی ہے"۔ جب تقریر ختم ہوئی تو مذکورہ بزرگ لیڈر صاحب کے پاس گیے اور کہا کہ اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا ہے کہ بابری مسجد خون مانگ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا اور جاننا چاہتا ہوں کہ کس کا خون، میرے بچوں کا یا آپ کے بچوں کا۔ لیڈر صاحب نے کہا کہ میرا تو صرف ایک بچہ ہے اور وہ اس وقت عرب میں زیر تعلیم ہے۔ مذکورہ صاحب نے کہا تو گویا آپ اپنی اولاد کو تو تعلیم و ترقی کے میدان میں سرگرم کیے ہوئے ہیں اور دوسروں کی اولاد کو کٹنے مرنے کے میدان میں سرگرم کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر لیڈر صاحب بگڑ گیے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے تمام لیڈر صرف الفاظ کا جہاد کر رہے ہیں۔ وہ دوسروں کو جوش

دلاتے ہیں کہ وہ آگ کے سمندر میں کود پڑیں۔ مگر خود اپنے بچوں کو لے کر دور ساحل پر کھڑے رہتے ہیں۔ یہی سادہ سا راز ہے جس نے ان لیڈروں کو فسادات کی تباہی سے بچا رکھا ہے۔ اب مسلمانوں کو بھی یہی کرنا چاہیے کہ وہ لیڈر کے الفاظ کو الفاظ سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ وہ خود بھی وہی کریں جو لیڈر لوگ کرتے ہیں، وہ ہرگز وہ نہ کریں جو لیڈر لوگ کہتے ہیں، اور اس کے بعد وہ ہر تباہی سے مکمل طور پر محفوظ رہیں گے۔

۴۔ ایک مقامی مسلمان لیڈر ہیں۔ پہلے وہ اپنے محلہ میں بالکل بے محابا طریقہ سے رہتے تھے۔ کسی کی بات انھیں برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ بات بات میں دوسروں سے لڑنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

اس کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ جلد جلد تین بچے پیدا ہوگیے۔ یہ بچے کچھ بڑے ہوئے تو گھر کے باہر محلہ میں چلنے پھرنے اور کھیلنے لگے۔ اب لیڈر صاحب کے اندر ایک نیا ذہن پیدا ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ میں اکثر گھر سے باہر رہتا ہوں۔ گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں ہے۔ میرے بچے اکثر کھیلنے کے لیے یا کسی کام کے لیے باہر نکلتے ہیں۔ اگر میں پہلے کی طرح محلہ والوں سے لڑائی جاری رکھوں تو اس کا خمیازہ میرے بچوں کو بھگتنا پڑے گا۔ جس شخص کو بھی مجھ سے شکایت پیدا ہوگی وہ اس کا انتقام میرے چھوٹے بچوں سے لے گا۔ اس سوچ کا آنا تھا کہ لیڈر صاحب بالکل بدل گیے۔ جس محلہ میں پہلے وہ لڑ بھڑ کر رہنے کا نظریہ اپنائے ہوئے تھے وہاں اب وہ میٹھے بول بول کر اور مل جل کر رہنے کے نظریہ پر عمل کرنے لگے۔

ان کی اس تبدیلی کو دیکھ کر ایک شخص نے پوچھا: جناب اب تو آپ بالکل بدل گیے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آپ وہی شخص ہیں جو پہلے تھے۔ لیڈر صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: بھائی، میرے بچوں نے مجھ کو بزدل بنا دیا۔

ہمارے تمام لیڈر قوم کے بچوں کو بہادری کا سبق دیتے ہیں۔ مگر خود اپنے بچوں کے لیے وہ بزدل بنے ہوئے ہیں۔ زندگی کا یہی وہ راز ہے جس نے تمام لیڈروں کو ذاتی نقصان سے بچا رکھا ہے۔ اب قوم کو چاہیے کہ وہ لیڈروں کی پرجوش تقریروں پر دھیان نہ دے۔ وہ خود بھی "بزدلی" کے اسی نسخہ کو اپنائے جس کو اپنا کر ہمارے تمام لیڈر ترقی اور کامیابی کے منازل طے کر رہے ہیں۔

اس کے بعد کوئی نقصان پہونچانے والا ان کو نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

۵۔ لیڈر صاحبان عام طور پر مسلمانوں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ تم کو دب کر نہیں رہنا ہے، اگر تم دب گیے تو لوگ تم کو اور زیادہ دبائیں گے۔ یہاں تک کہ تمہارا خاتمہ ہی کر دیں گے۔ مگر یہی لیڈر حضرات اس وقت دبنے کے طریقے پر عمل کر کے اپنے مسئلہ کو حل کرتے ہیں جب کہ خود ان کا ذاتی معاملہ زد میں آگیا ہو۔

ایک لیڈر صاحب کا ایک ادارہ تھا۔ اس ادارہ کے احاطہ میں امرود کا ایک باغ تھا۔ قریب کے محلہ کی ایک گائے اس باغ میں گھس آئی۔ مسلم باغبان نے گائے کو بھگانے کے لیے اسے مارا۔ اتفاق سے اس کو گردن کے پاس سخت چوٹ آگئی۔ اس کے بعد جب وہ بھاگنے لگی تو باغ کے کنارے کے خاردار تار میں پھنس کر وہ اور زیادہ زخمی ہو گئی۔

یہ گائے جب اپنے ہندو مالک کے گھر پہونچی تو اس کے خون آلود جسم کو دیکھ کر ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ جب معلوم ہوا کہ مسلم ادارہ کے آدمی نے اس کو مارا ہے تو محلّہ کے لوگ سخت مشتعل ہو گیے۔ ایک بڑا مجمع ادارہ کے احاطہ میں گھس آیا۔ وہ اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا اور یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ مارنے والے آدمی کو ان کے حوالہ کیا جائے۔ اس دوران میں وہ آدمی باغ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور ادارہ کے ایک کمرے میں چھپ گیا تھا۔ ادارہ والوں نے دیکھا کہ اس وقت یہ مجمع سخت غصہ میں ہے، اس لیے اس وقت آدمی کو ان کے حوالے کرنا مناسب نہ ہوگا۔ وہ مجمع کی اشتعال انگیزی سے مشتعل نہیں ہوئے۔ انھوں نے حکیمانہ گفتگو کر کے اس کو ایک دن کے لیے ٹال دیا۔ اور کہا کہ آپ ہمیں ایک دن کا موقع دیجیے۔ ہم اس آدمی کو تلاش کر کے کل تک ضرور اس کو آپ کے حوالے کر دیں گے۔

مجمع کو واپس کرنے کے بعد ادارہ کے لوگوں نے باغبان کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو، ایک طرف تمہاری ذات ہے اور دوسری طرف ایک پورا مسلم ادارہ ہے اگر وہ تم کو نہیں پاتے ہیں تو وہ اپنا غصہ سب لوگوں پر اتاریں گے۔ تم ہمت کر کے اللہ کے بھروسہ پر ایسا کرو کہ گائے کے مالک کے یہاں جا کر حاضر ہو جاؤ اور اپنی غلطی کا اقرار کر لو۔ ان سے کہو کہ یہ میری ذاتی غلطی ہے، آپ مجھ کو جو سزا چاہیں دیں۔ اگر وہ لوگ کچھ جذبہ میں آکر تمہیں ڈانٹیں ماریں تو اس کو بھی برداشت

کر لینا۔ چنانچہ اگلے دن وہ آدمی گائے کے مالک کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔ واقعۃً مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں وہ مجھ کو منظور ہے۔

انسان بہر حال انسان ہے۔ باغبان جب اس طرح حاضر ہو گیا اور اس نے سیدھے طور پر غلطی کا اعتراف کر لیا تو گائے والوں کے جذبات بھی ٹھنڈے پڑ گیے۔ انھوں نے کہا کہ خیر اب جاؤ۔ اگر کل تم مل گیے ہوتے تو ہم تم کو مارے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اب گائے کو ہم نے اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ اگر وہ مر گئی تو البتہ تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔ (الجمعیۃ ویکلی، دھلی، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۷)

اس طرح ایک معاملہ جو ایک مسلم ادارہ بلکہ پورے شہر میں آگ لگا سکتا تھا، وہ نہایت آسانی سے وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ ادارہ والوں نے جس تدبیر کا تجربہ اپنے ذاتی معاملہ میں کیا اسی کا سبق اگر وہ پوری قوم کو اس طرح کے معاملات میں دیں تو کتنے ہونے والے حادثات ہونے سے رہ جائیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے قائدین اپنے ذاتی معاملات کو حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ اور ملت کو یہ سبق دیتے ہیں کہ تم خدا کے فوجدار ہو، کسی کی پروا کیے بغیر مجاہدانہ طور پر لڑ جاؤ۔ تاہم مسلمانوں کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ اس معاملہ میں وہ لیڈروں کی تقریروں کو ہرگز نہ سنیں، وہ ان کے عمل کو دیکھیں۔ یہ لیڈر صاحبان جس طرح خاموش تدبیر سے اپنے ذاتی معاملہ کو حل کرتے ہیں، اسی طرح وہ بھی اپنے معاملات کو حل کریں، اور اس کے بعد انشاءاللہ وہ ہر فساد سے محفوظ ہو جائیں گے۔

۶۔ عرب کے سفر میں میری ملاقات ایک ہندستانی مسلمان سے ہوئی۔ پہلے وہ ہندستان میں مسلمانوں کے درمیان لیڈری کرتے تھے۔ اس کے بعد انھیں عرب میں ایک اچھا کام مل گیا اور وہ وہاں منتقل ہو گیے۔ آج کل وہ عرب میں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہندستان کیسا وحشی ملک ہے۔ وہاں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں کسی مسلمان کی جان و مال محفوظ نہیں۔ آپ دیکھیے ہم لوگ یہاں کتنے سکون کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ یہاں کا نظام آپ کو جو کچھ دے رہا ہے اس کا آپ

نے ذکر کیا، مگر آپ خود یہاں کے نظام کو جو کچھ دے رہے ہیں، اس کا ذکر کرنا آپ بھول گیے۔ میں نے کہا کہ آپ جس ڈھنگ سے عرب میں رہتے ہیں، اگر ہندستان کے مسلمان اسی ڈھنگ سے ہندستان میں رہیں تو وہ ہندستان میں بھی اسی طرح باعزت طور پر رہ سکتے ہیں جس طرح آپ عرب میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ عرب میں آپ کے پرسکون طور پر رہنے کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ یہاں کے نظام کے ساتھ کامل توافق (Adjustment) ہے۔ اگر ہندستان کے مسلمان اپنے ملک کے نظام سے اسی طرح توافق اور ہم آہنگی کے ساتھ رہیں تو ایک دن میں سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔

میں نے کہا کہ ساری عرب دنیا میں وطنی کے مقابلہ میں خارجی کو نمبر ۲ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ مگر آپ اس کو برداشت کرتے ہیں۔ یہاں ایک ہندستانی کے مقابلہ میں ایک امریکی کو کئی گنا زیادہ تنخواہ ملتی ہے مگر آپ اس امتیاز کو گوارا کیے ہوئے ہیں۔ یہاں آپ کو یہ اجازت نہیں کہ مسجد میں یا مسجد کے باہر لاؤڈ اسپیکر لگا کر تقریر کریں۔ یہاں آپ نہ کوئی آزاد اخبار نکال سکتے اور نہ کوئی آزاد رسالہ چھاپ سکتے ہیں مگر اس کے خلاف آپ جیل بھرنے کی مہم نہیں چلاتے۔ یہاں واضح طور پر بہت سے غیر شرعی امور پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر ان کے بارہ میں آپ بالکل خاموش ہیں۔ آپ حضرات اس قسم کی چیزوں کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتے اور نہ ان مسائل پر کوئی جلوس نکالتے۔

میں نے کہا کہ عرب میں آپ کو جو پرسکون زندگی حاصل ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں کے نظام سے ہم آہنگی اختیار کر کے آپ نے اس کی ضروری قیمت ادا کر دی ہے۔ اگر ہندستان کے مسلمان یہ قیمت ادا کرنے پر راضی ہو جائیں تو وہاں بھی وہ عزت اور کامیابی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ عرب ملکوں میں جاتے ہیں، حتی کہ ان کے اکابر جو کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے لیے عرب کے سفر کرتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں عام ہندستانی مسلمانوں کے لیے زبردست سبق ہے۔ یہ مسلمان اور یہ اکابر عرب میں جا کر جس طرح وہاں کے نظام سے موافقت کر کے رہتے ہیں، اسی طرح ہندستانی مسلمان بھی ہندستان کو اپنا ملک سمجھیں اور یہاں کے حالات

سے موافقت کرکے زندگی گزاریں۔ اس کے بعد انشاء اللہ ان کے لیے یہاں کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

۷۔ ایک لیڈر صاحب ہیں۔ لیڈر ہونے کے ساتھ وہ ایک اسلامی ادارہ بھی چلاتے ہیں۔ اور اس کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں۔ یہ لیڈر صاحب اپنی پرجوش تقریروں میں اکثر اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہیں :

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ہمیشہ "اینٹی گورنمنٹ" لہجہ میں بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وزیروں اور گورنروں کی پروا نہیں کرتا۔ میں صرف خدا کی پروا کرتا ہوں اور اسی سے ڈرتا ہوں۔ حکمرانوں سے استغنا برتنا اور انھیں نظر انداز کرنا ان کا خاص کمال سمجھا جاتا ہے۔ ان کی اس قسم کی تقریروں کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے حلقہ کے لوگوں میں عام طور پر یہ ذہن بن گیا ہے کہ جو شخص حکمرانوں سے قریب ہو یا ان کے حق میں بھلائی کا کلمہ کہے تو وہ یقینی طور پر ابن الوقت اور موقع پرست ہے۔

مذکورہ لیڈر صاحب کا یہ انداز وہ ہے جس کو وہ اپنی تقریروں میں برتتے ہیں۔ مگر خود اپنے عملی معاملات میں ان کا طریقہ سراسر اس سے مختلف ہے۔ مثلاً ان کے ادارہ اور شاہراہ عام کے درمیان کوئی سڑک نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں ایک ایسی سڑک بن جائے جو ادارہ کو شاہراہ عام سے جوڑ دے تاکہ سفر آسان ہو سکے۔

بہ ظاہر یہ ایک مشکل کام تھا، مگر ان کے زرخیز ذہن نے اس کا نہایت خوبصورت حل دریافت کرلیا۔ انھوں نے اپنے ادارہ کے احاطہ میں ایک "بین اقوامی" کانفرنس کی جس میں عرب کے کئی شیوخ بھی شریک ہوئے۔ اب لیڈر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ایک باضابطہ دعوت نامہ تیار کیا جس میں ریاست کے ہندو چیف منسٹر کو "خصوصی مہمان" کے طور پر کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ چیف منسٹر صاحب نے بخوشی یہ دعوت قبول کرلی۔ وہ جب اپنی سرکاری کار سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تو انھیں غیر معمولی اعزاز دیا گیا۔ مگر انھیں یہ دیکھ کر شرم آئی کہ بیرونی ملکوں کے مہمان ان کے شہر میں آئیں اور ان کو اجتماع گاہ تک پہنچانے کے لیے معقول راستہ موجود نہ ہو۔ لیڈر صاحب کے ساتھیوں نے چیف منسٹر کے اس احساس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جلد ہی وہاں ادارہ اور شاہراہ عام

کے درمیان ایک عمدہ سڑک تعمیر ہو چکی تھی۔
اب میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ آپ کے لیڈر اگر حکمرانوں کے خلاف تقریر کریں تو آپ ہرگز ایسی تقریروں کو سنجیدہ طور پر نہ لیں۔ آپ سرکاری افسروں اور حکام سے اچھے تعلقات رکھیں اور اس کے بعد آپ کے سب کام اسی طرح بخوبی طور پر انجام پا جائیں گے جس طرح لیڈروں کے اپنے کام بخوبی طور پر انجام پا رہے ہیں۔

۸۔ شریمتی سبھدرا جوشی (پیدائش ۱۹۱۹) ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ انھوں نے کرسچین کالج لاہور سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور پھر ملکی سیاست میں شامل ہو گئیں۔ وہ مہاتما گاندھی کی ساتھیوں میں سے ہیں۔
سبھدرا جوشی نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ ۱۹۴۷ کے فسادات میں ہم دہلی کے مسلم محلوں میں کام کر رہے تھے۔ دلی کانگریس پر ہمارا قبضہ تھا۔ گاندھی جی آئے۔ انھوں نے ہم سے پوچھا کہ کتنے مسلمان مارے گیے۔ ہم نے بتایا: دس ہزار سے زیادہ مارے گیے ہیں۔ وہ بہت برہم ہوئے اور کہا کہ تم نے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ہم نے کہا، ہم تو برابر کوشش کر رہے ہیں، مگر حالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ انھوں نے غصہ میں پوچھا، ان دس ہزار میں تمہارے کانگریسی ورکر کتنے مارے گیے۔ ہم نے جواب دیا ایک بھی نہیں۔ اس پر وہ بولے "پھر میں کیسے مان لوں کہ تم نے بچانے کی کوشش کی ہو گی" (ماہنامہ شبستاں، دہلی، جون ۱۹۷۲)
گاندھی جی کے اس تبصرہ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ لیڈر لوگوں نے فساد زدہ عوام کو بچانے کا کام ہی نہیں کیا، وہ بس دور دور سے اس کا کریڈٹ لیتے رہے۔ اگر واقعۃً وہ فساد زدہ عوام کو بچانے کی کوشش کرتے تو جس طرح دوسرے لوگ مارے گیے وہ بھی انھیں کے ساتھ مارے جاتے۔
اس پہلو سے قطع نظر، اس واقعہ میں ایک اور سبق ہے۔ وہ یہ کہ لیڈر لوگوں کے پاس کوئی ایسا نسخہ ہوتا ہے کہ عین اس وقت بھی لیڈروں میں سے کوئی لیڈر مارا نہ جائے جب کہ دوسرے لوگ دس ہزار سے زیادہ کی تعداد میں مار ڈالے گیے ہوں۔ اب میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ لیڈروں کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ کریں۔ اگر انھوں نے اس راز کو جان لیا تو انھیں یہ شکایت

کرنے کی ضرورت نہ رہے گی کہ ان کا جان و مال اس ملک میں غیر محفوظ ہے۔

اگر آپ لیڈر صاحبان کی زندگی کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ لیڈروں کے محفوظ رہنے کا نسخہ وہی حکمت اور احتیاط کا طریقہ ہے جو الرسالہ میں پچھلے دس سال سے پیش کیا جارہا ہے۔ یہ لیڈر صاحبان بظاہر الرسالہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہیں مگر اپنی ذاتی زندگی میں وہ پوری طرح اس طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ پھر آپ بھی کیوں نہ اسی حفاظتی طریقہ کو اپنالیں۔ ایسا کرکے آخر کار آپ وہی کریں گے جو آپ کے لیڈر بہت پہلے سے کر رہے ہیں۔

۹۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان ایک ریاست میں سرکاری ملازم ہیں۔ ایک بار وہ اپنے محکمہ کے کام سے دہلی آئے۔ درمیان میں انھیں اپنے "چیف" سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انھوں نے دہلی سے ٹرنک کال کیا۔ جب وہ ٹیلی فون پر اپنے چیف سے بات کر رہے تھے تو میں نے سنا کہ ان کی زبان سے صرف "ہاں صاحب، جی صاحب" "ہاں صاحب، جی صاحب" کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ اس وقت اگرچہ وہ اپنے چیف سے سیکڑوں میل دور تھے۔ مگر حال یہ تھا کہ بات کرتے ہوئے کرسی سے اٹھے چلے جارہے تھے، جیسے کہ چیف صاحب خود ان کے سامنے موجود ہوں۔

"ہندو چیف" سے جب ان کی بات ختم ہوگئی تو ان سے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو شروع ہوئی۔ اس درمیان میں الرسالہ کا نام آیا۔ ان کا لہجہ فوراً بدل گیا۔ انھوں نے کہا آپ تو پوری قوم کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے الرسالہ کا سخت مخالف ہوں۔" انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ اسلام ہمیشہ اقدام کی تعلیم دیتا ہے۔ اور آپ مسلمانوں کو انفعالی روش کی طرف لے جانا چاہتے ہیں:

Islam stands for an active approach in all matters
and forbids all that leads to a passive surrender.

میں نے آہستگی سے کہا کہ مجھ میں اور آپ میں جو فرق ہے وہ نقطۂ نظر کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ اصلی فرق یہ ہے کہ آپ ایک ڈبل اسٹینڈرڈ آدمی ہیں اور میں ڈبل اسٹینڈرڈ آدمی نہیں۔ میرا ایک ہی اصول ہے، ایک معاملہ میں بھی اور دوسرے معاملہ میں بھی۔

انھوں نے بگڑ کر کہا کہ اس کا کیا مطلب ہے ۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے ذاتی معاملہ میں مفاہمت کے اصول پر قائم ہیں ۔اور دوسروں کو ٹکراؤ کے راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں ۔ آپ کا سابقہ جن ہندوؤں (اعلیٰ افسران) سے پڑتا ہے ان کے ساتھ آپ مبالغہ آمیز حد تک اسی نرم روش کو اپنائے ہوئے ہیں جس کی تلقین الرسالہ میں کی جاتی ہے ۔ دوسری طرف مسلمانوں کے معاملہ میں یہ چاہتے ہیں کہ ان کا سابقہ جن ہندوؤں سے پڑے ان کے مقابلہ میں وہ آخری حد تک کرٹے بن جائیں ۔

مذکورہ مسلم دانشور اور ان کے جیسے دوسرے تمام مسلمانوں کے معاملات پوری طرح درست ہیں ۔ ان کے بچے اعلیٰ ڈگریاں لے کر بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر رہے ہیں ۔ اس کا راز صرف یہ ہے کہ وہ زبان سے اگرچہ لڑائی بھڑائی کی باتیں کرتے ہیں ، مگر عملاً اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو لڑائی بھڑائی سے سیکڑوں میل دور رکھتے ہیں ۔ اب میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ بھی اسی طریقہ کو اپنالیں ۔ تصادم اور اقدام ، جیسی باتوں کو وہ صرف کہنے کی بات سمجھیں وہ ہرگز انھیں اپنا عملی پروگرام نہ بنائیں ۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا اور ان کے بچوں کا مستقبل بھی اسی طرح محفوظ رہے گا جس طرح ہمارے رہنماؤں اور دانشوروں کا مستقبل پوری طرح محفوظ ہے ۔

خلاصہ

اوپر جو کچھ کہا گیا ، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے "قتل عام" کے باوجود خود مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جس کو اب بھی اس ملک میں حفاظتِ عام حاصل ہے ۔ یہ طبقہ مسلم لیڈروں کا ہے ۔ یہ دراصل مسلم لیڈر ہی ہیں جو ہندستان میں مذکورہ "قتل عام" کا انکشاف کرتے رہتے ہیں ۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود مسلم لیڈر اس قتل عام سے ہمیشہ اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔

ہم مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ بھی وہی کریں جو ان کے لیڈر کرتے ہیں ۔ لیڈروں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں ۔ فرقہ وارانہ نقصان سے بچنے کے لیے مسلمان بھی اپنے لیڈروں کی اسی آزمودہ تدبیر کو اختیار کرلیں ۔ مسلمان اپنے لیڈروں کے قول کو نہ دیکھیں بلکہ وہ صرف ان کے عمل کو دیکھیں ۔ اس معاملہ میں لیڈر لوگ دوسروں سے جو کچھ کہتے ہیں اس کو وہ نظر انداز کر دیں ، اور صرف یہ پتہ لگائیں کہ وہ خود کیا کر رہے ہیں ۔

دو تصویریں

ہندستان کے ایک مسلمان لیڈر ہیں۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں۔ اور پچھلے دس برس سے اس ملک میں وہ سیاست چلا رہے ہیں جس کا نام انھوں نے " اپوزیشن کی سیاست " رکھا ہے۔ وہ ایک ماہانہ رسالہ نکالتے ہیں جس کا نام " مسلم ہندستان " مگر زیادہ صحیح لفظوں میں " ظالم ہندستان " ہے۔ اس پرچے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر مہینہ مسلمانوں کے اوپر ظلم و تعصب کی داستانیں چھاپی جاتی ہیں۔ لیڈر صاحب کے ہر بیان اور ہر تقریر میں اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ وہ پولیس کی گولیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ انھیں زندگی کے ہر شعبہ سے دھکے دے کر نکالا جا رہا ہے۔ ان کے ملی تشخص کو مٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

دسمبر ۱۹۸۸ میں میں امریکہ کے سفر پر تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو مذکورہ لیڈر کے ماہنامہ (مسلم ہندستان) کے خریدار ہیں۔ اور اس کو برابر پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ " اس ماہنامہ کو میں اس لئے پڑھتا ہوں تاکہ ہندستانی مسلمانوں کے حالات معلوم ہو سکیں۔ اس ماہنامہ کو پڑھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے کوئی اسکوپ نہیں۔ وہاں محرومی اور مظلومی کے سوا ان کا کوئی اور مقدر نہیں "۔ اس ماہنامہ کا خاص طریقہ یہ ہے کہ یہاں اگر ۹۹ پلس پوائنٹ ہوں تو وہ ان کا ذکر نہیں کرے گا، اور اگر ایک مائنس پوائنٹ مل جائے تو اس کو خوب نمایاں کر کے بیان کرے گا۔

مذکورہ مسلمان لیڈر کا ایک مفصل انٹرویو دہلی کے ایک اردو ہفت روزہ (۳۱ مارچ تا ۶ اپریل ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ میں نے اس انٹرویو کو پڑھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے میں اس کے اس حصہ پر پہنچا جہاں انھوں نے انٹرویو رکو اپنے گھر کے اندرونی حالات بتائے ہیں۔ " اب میں ذاتی بات آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ۶ بچے ہیں۔ جن میں پانچ لڑکیاں ہیں "۔ مسلمان لیڈر کے ان الفاظ کو پڑھ کر میں نے کچھ دیر کے لئے اخبار بند کر دیا۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچنا شروع کیا کہ لیڈر صاحب نے اس کے بعد انٹرویو رسے کیا کہا ہوگا۔ انھوں نے اپنے بچوں کے بارہ میں کس قسم کی خبریں بتائی ہوں گی۔

لیڈر صاحب کے بیانات، ان کی تقریروں اور تحریروں میں جس "مسلم ہندستان" کی تصویر پیش جاتی ہے، اس کی روشنی میں میں نے سوچنا شروع کیا تو قیاسی طور پر جو بات میری سمجھ میں آئی وہ بڑی بھیانک تھی۔

میں نے سوچا کہ لیڈر صاحب نے غالباً یہ خبر دی ہوگی کہ میرا ایک لڑکا ہے۔ اس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں مارا مارا پھرا۔ مگر اس کو کہیں داخلہ نہیں ملا۔ اس کی تعلیم نامکمل رہ گئی۔ آخر مجبور ہو کر وہ رکشا چلانے لگا تاکہ کسی طرح اپنا پیٹ پال سکے۔

میرا لڑکا ماشاء اللہ پنج وقتہ نمازی ہے۔ ہمارے علاقہ میں ایک ویران مسجد تھی۔ میرے لڑکے نے محلہ والوں کی مدد سے اس کو رنگ و روغن کرایا اور اس میں باقاعدہ نماز قائم کی۔ فرقہ پرست اور ملک دشمن عناصر کو یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔ وہ ایک روز ہجوم کرکے آئے۔ انھوں نے مسجد میں گھس کر میرے لڑکے کو بری طرح مارا پیٹا۔ اس کی داڑھی نوچی جس کو وہ اپنے مذہبی تشخص کے نشان کے طور پر نہایت عزیز رکھتا ہے۔ لڑکے کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں وہ بہت دنوں تک زیر علاج رہا۔

میری ایک لڑکی کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ کوشش کے باوجود اس کو اچھے انگریزی اسکول میں داخلہ نہیں ملا۔ مجبوراً اس کو ایک معمولی قسم کے اردو میڈیم اسکول میں داخل کرنا پڑا۔ لڑکی نے پاس کورس سے بی اے کیا۔ اس کے بعد وہ ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ مگر داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایم اے نہ کر سکی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کو کوئی اچھی سروس نہیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ اب وہ گھروں پر جا جا کر اردو اور قرآن کا ٹیوشن کرتی ہے۔ اور اس طرح زندگی کے دن گزار رہی ہے۔

یہی میرے سب بچوں کا حال ہوا۔ ملک میں اندھے تعصب کی وجہ سے کسی کی بھی اچھی تعلیم نہ ہو سکی۔ میری تمام لڑکیاں ماشاء اللہ مذہبی ہیں۔ سب کی سب خدا کے فضل سے شرعی برقعہ پہنتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ جہاں بھی جاتی ہیں، ان کے برقعہ کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی تشخص پر حملے کئے جاتے ہیں۔ کسی بھی اسکول یا کالج میں ان کو نہ داخلہ ملتا ہے اور نہ ملازمت۔

آخر کار میں نے اعلیٰ تعلیم سے مایوس ہو کر یہ طے کیا کہ لڑکیوں کی شادی کر دوں۔ مگر جب

میں اپنی لڑکیوں کے لئے مسلمان شوہر کی تلاش میں نکلا تو معلوم ہوا کہ یہاں تعلیم سے بھی زیادہ بڑی مشکلات حائل ہیں۔

ہندستان کی ظالم پولیس نے مسلم نوجوانوں کو صحیح سالم حالت میں باقی نہیں رکھا تھا۔ میں نے پایا کہ کسی مسلم نوجوان کا حال یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں پولیس کی گولی لگی اور اس کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا، جہاں ڈاکٹر نے اس کا ایک پاؤں کاٹ دیا۔ کسی مسلم نوجوان کو پولیس تھانہ میں لے گئی اور اس کے ساتھ اتنی زیادہ مارپیٹ کی کہ اس کا دماغی توازن خراب ہوگیا۔ کسی مسلم نوجوان کو پولیس نے رائفل کے کندوں سے مار مار کر اس کا ہاتھ توڑ ڈالا۔ میری تلاش نے مجھے بتایا کہ قوم کے نوجوانوں کو پولیس نے یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، اور جو زندہ بچے ہیں وہ بھی اس حال میں ہیں کہ ان کا جسم اور ان کے اعضاء صحیح سالم نہیں۔

مجھ کو بہرحال اپنی لڑکیوں کی شادی کرنی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر انھیں مظلوم اور معذور نوجوانوں میں سے کچھ نوجوانوں کو منتخب کیا اور ان کا نکاح اپنی لڑکیوں کے ساتھ کر دیا۔ اب میرے گھر کا حال یہ ہے کہ وہ بیک وقت معذور خانہ بھی بنا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ غریب خانہ بھی۔ میرا گھر اس "مسلم ہندستان" کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس کا زیادہ بڑا نقشہ میں ہر مہینہ اپنے پرچہ میں دکھاتا ہوں۔

میری لڑکیاں اپنے لنگڑے لولے شوہروں کے ساتھ اس طرح رہ رہی ہیں کہ ان کی زندگیاں خوشیوں سے خالی ہو چکی ہیں۔ آسمان نے کبھی ان کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں اپنے بچوں اور اپنے دامادوں سے کہتا ہوں کہ گھبراؤ نہیں، جو دنیا میں کھوئے وہ آخرت میں پاتا ہے۔ جو انسانوں کی طرف سے محروم کیا جائے اس کو خدا کی طرف سے سرفرازی عطا کی جاتی ہے۔

لیڈر صاحب کے اپنے بیانات کی روشنی میں میں نے ان کے گھر کی یہ قیاسی تصویر بنائی اور اس کے بعد دوبارہ اخبار کھولا اور لیڈر صاحب کے انٹرویو کا بقیہ حصہ پڑھنا شروع کیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ لیڈر صاحب کے گھر کا نقشہ اس نقشہ سے سراسر مختلف ہے جو میں نے قیاسی طور پر سمجھا تھا۔ ناقابل فہم حیرانی کے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا

وہ اس "مسلم ہندستان" میں نہیں ہیں جس کی خبر وہ صبح وشام اپنے ہم قوموں کو دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک اور ملک میں ہیں جو ان کے بیانات والے ملک سے یکسر مختلف ہے۔ انٹرویو کے مطابق لیڈر صاحب کے الفاظ یہ تھے:

"اب میں ذاتی بات آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ۶ بچے ہیں۔ جن میں پانچ لڑکیاں ہیں۔ اور ہمارے سماج میں جس کی اتنی لڑکیاں ہوں، اس کے لئے کتنی پریشانیاں ہوتی ہیں، اس کا احساس آپ کو بھی ہوگا۔ میں نے ایک ہی بات کا وعدہ اپنی اہلیہ سے کیا کہ کچھ ہو جائے، ہم بھوکے مریں، مگر بچوں کی تعلیم پر اثر نہیں ہونے دیں گے۔ آج دس برس بعد اللہ کے فضل سے میری بڑی بیٹی کی شادی ہوگئی۔ اس کا شوہر آئی اے ایس آفیسر ہے۔ دوسری بیٹی کی شادی ہوگئی اور اس کا شوہر ایم ڈی ہے۔ میرا لڑکا امریکہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی کی سب سے مایۂ ناز ڈگری آپریشن ریسرچ میں پی ایچ ڈی ہے۔ اس کے بعد کی میری لڑکی اللہ کے فضل سے ڈاکٹر ہو چکی ہے، اور آج وہ دہلی میں ہاؤس سرجن ہے۔ اس کے بعد کی لڑکی آئی آئی ٹی سے دو مہینوں میں انجنیئرنگ کا کورس مکمل کرلے گی۔ وہ وہاں کی ٹاپر ہے۔ آج اس کے سامنے دسیوں ملازمتوں کے آفر ہیں۔ اور میری آخری اولاد دہلی یونیورسٹی میں بی ایس سی آنرز کے دوسرے سال میں ہے۔"

یہ دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ لیڈر صاحب اگرچہ اسی ملک میں رہتے ہیں، مگر ان کے گھر کا حال اس مسلم ہندستان (یا ظالم ہندستان) سے سراسر مختلف ہے جس کی خبر وہ دنیا کو اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ پچھلے دس سال سے دے رہے ہیں۔ ان کے بیانات کے مطابق، "مسلم ہندستان" میں مسلمان صرف ایک برباد شدہ قوم بنا دئے گئے ہیں۔ مگر اسی "مسلم ہندستان" میں ان کا اپنا گھر ترقی اور خوش حالی کی اعلیٰ شاہراہ پر گامزن ہے۔

۱۹۸۹ میں مذکورہ مسلمان لیڈر کے سیاسی کیریر کے دس سال پورے ہوگئے۔ اس دس سال میں، خود ان کے اپنے بیان کے مطابق، ان کے "۶ بچوں" کا مستقبل اتنا شاندار ہو چکا ہے کہ وہ خود اس پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اسی دس سال میں ملت کے بچوں کا حال یہ ہے کہ دوبارہ، خود

ان کے اپنے بیان کے مطابق ، وہ بدستور ظالمانہ تعصب کا شکار ہیں۔ ان کے سینے اب بھی پولیس کی گولیوں سے چھلنی کئے جارہے ہیں۔ گویا شاعر کے الفاظ میں :

دو پھول ساتھ پھوٹے قسمت جدا جدا ہے نوشہ نے ایک پہنا اک قبر پر چڑھا ہے

اس فرق کا راز کیا ہے۔ اس سوال پر غور کرتے ہوئے مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آیا جو نومبر ۱۹۸۷ میں میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں ہندستان کے ایک شہر میں چند روز کے لئے گیا ہوا تھا۔ وھاں میرا قیام ایک ہوٹل میں تھا۔ ایک مقامی مسلمان لیڈر مجھ سے ملنے کے لئے میرے کمرے میں آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میں آپ کا الرسالہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مگر آپ مسلمانوں کو جو سبق پڑھا رہے ہیں ، وہ بزدلی کا سبق ہے۔ وہ مسلمانوں کو ہزیمت . شکست، احساس محرومی اور مایوسی کی طرف لے جارہا ہے۔ مجھے آپ کے اس نظریہ سے سخت اختلاف ہے۔

آخر میں انھوں نے کہا کہ چلئے ، آپ کو شہر کی سیر کرادیں۔ اس کے بعد وہ مجھ کو اپنی نئی ماروتی کار پر بیٹھا کر شہر کے مختلف حصوں کو دکھاتے رہے۔ راستہ میں انھوں نے بتایا کہ میں یہاں کی میونسپل کمیٹی میں نائب چیرمین ہوں۔ میں نے کہا کہ اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد بمشکل ۵ فی صد ہوگی۔ ایسی حالت میں آپ میونسپل انتخابات میں کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا : اپنے ذاتی معاملہ میں میری پالیسی وہی ہے جو الرسالہ کی پالیسی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میں یہاں کے ہندوؤں سے ہمیشہ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتا ہوں۔ ان کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مقامی پولیس اور انتظامی افسران سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ برادرانِ وطن کو مختلف مواقع پر تحفے تحائف بھی دیتا رہتا ہوں۔ اس لئے یہاں کے سب لوگ مجھ سے خوش ہیں۔ مجھ کو مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے بھی کافی ووٹ ملتے ہیں۔ کوئی بات ناخوشگواری کی ہو تو میں اس کی پروا نہیں کرتا۔

اب مذکورہ مسلمان لیڈر کی کامیابی کا راز میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے جان لیا کہ انٹرویو دینے والے لیڈر صاحب کا معاملہ بھی یقیناً یہی ہے۔ لیڈری کے اسٹیج پر تو وہ اپنی وہ پالیسی چلاتے ہیں جس کو وہ " اپوزیشن کی سیاست" یا احتجاجی سیاست کہتے ہیں۔ مگر اپنے گھر اور اپنے بچوں کے

معاملہ میں وہ عین اسی طریقہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس کی نشان دہی الرسالہ میں تقریباً پندرہ سال سے کی جارہی ہے۔ یعنی حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنا اور حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے معاملات کو درست کرنا۔ باہر وہ الرسالہ کے مخالف ہیں اور اندر وہ اس کو اپنا پیرومرشد بنائے ہوئے ہیں۔

لیڈر صاحب نے اپنے انٹرویو میں اس بات کی تردید کی ہے کہ اس وقت ہندستان میں جو حالات ہیں، اس کے باقی رہتے ہوئے بھی مسلمان ترقی کی طرف گامزن ہوسکتے ہیں، ان کی موجودگی میں بھی مسلمان اپنے لئے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کرسکتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں: مسلمان ایجی ٹیشن کی سیاست چھوڑ کر اگر صرف تجارت کریں تو یہاں کوئی انھیں تجارت کرنے نہیں دے گا۔ مسلمان اگر صرف تعلیمی جدوجہد میں مصروف ہونا چاہیں، تو انھیں تعلیمی جدوجہد کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس ملک میں جو یلغار ہے، وہ ہمارے پورے وجود پر ہے۔ اس میں اقتصادی، سماجی، سیاسی سارے حقوق اور اختیارات شامل ہیں۔ سیاسی تبدیلی لائے بغیر اور حقوق کی مانگ کئے بغیر مسلمانوں کو اس ملک میں کچھ نہیں ملے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہی "مسلم ہندستان" جس میں عام مسلمانوں کے لئے، لیڈر صاحب کے بیان کے مطابق، ترقی کے مواقع بالکل ختم ہوچکے ہیں۔ یہاں موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ مگر اسی مسلم ہندستان میں خود ان کا اپنا خاندان جو بچوں اور ان کے متعلقین کو ملا کر ایک درجن سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے، وہ کیسے کامیاب ہوگیا۔ کس طرح اس نے اسی ظالم ہندستان میں اپنے لئے قابل رشک حد تک ایک شاندار مستقبل تعمیر کرلیا۔

مذکورہ مسلمان لیڈر نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ انھوں نے طے کیا کہ "ہم بھوکے رہیں گے مگر ہم اپنے بچوں کو پڑھائیں گے۔" لیڈر صاحب نے اس پر باقاعدہ عمل کیا۔ ان کا کامیاب تجربہ بتاتا ہے کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ "مسلم ہندستان" کا ایک باشندہ "بھوکا" رہ کر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا سکے۔ حتی کہ صرف دس برس میں ان کا شاندار مستقبل بن کر کھڑا ہوجائے۔ دس سالہ محنت کے بعد۔ اس کا اپنا پیٹ بھی بھر جائے اور اس کے تمام بچوں کا بھی۔

لیڈر صاحب کے مذکورہ جملہ (ہم بھوکے رہیں گے مگر اپنے بچوں کو پڑھائیں گے) پر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس ایک جملے کے اندر معانی کا پورا خزانہ ہے۔ اس کے اندر زندگی کی تعمیر کا

زبردست راز چھپا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کو الرسالہ کے ذریعہ مسلسل طور پر مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ زندگی کی تعمیر کا یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کو راقم الحروف نے اپنے آرٹیکل مطبوعہ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) میں ان لفظوں میں بیان کیا تھا کہ مسائل کو بھوکا رکھو، مواقع کو کھلاؤ:

Starve the problems, feed the opportunities.

لیڈر صاحب نے، الرسالہ کے اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے، اپنے بچوں کو سکھایا کہ مسائل کو بھلاؤ اور مواقع کو استعمال کرو۔ حقوق طلبی کا جھنڈا مت اٹھاؤ بلکہ محنت کے ذریعہ اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرو۔ شکایت اور احتجاج کو چھوڑ دو اور مثبت ذہن کے تحت کام کرو۔ حالات سے لڑنے کی حماقت نہ کرو بلکہ حالات سے مطابقت کرکے اپنے مستقبل کی تعمیر کرو۔ ملک کے اندر غیر موافق پہلو بھی ہیں اور موافق پہلو بھی۔ تم لوگ غیر موافق پہلو کو نظرانداز کرو اور جو موافق پہلو ہیں ان پر اپنی ساری توجہ لگا دو۔ تم ٹکراؤ کے بجائے ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کرو۔

ایک لفظ میں یہ کہ میں گھر کے باہر لیڈری کے اسٹیج پر الرسالہ کے اصول کی مخالفت کروں گا، اور تم لوگ گھر کے اندر الرسالہ کے اصول کو دانتوں سے پکڑ لو۔ کیوں کہ یہاں کے حالات میں لیڈرانہ مقام الرسالہ والے طریقہ کی مخالفت کرنے میں ملے گا، اور حقیقی کامیابی اس کے طریقہ کو اختیار کرنے میں۔ یہی دو طرفہ تکنیک ہے جس نے بیک وقت دونوں کو کامیاب و بامراد کر دیا ہے، لیڈر کو بھی اور لیڈر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی۔

مسلمان لیڈر نے غالباً اسی مصلحت کی خاطر مزید اہتمام یہ کیا کہ اپنے تمام بچوں کو انگلش اسکولوں میں داخل کرکے پڑھایا۔ انھوں نے اپنے کسی بچہ کو اردو میڈیم اسکول میں تعلیم نہیں دلائی۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے مفروضہ مسلم ہندستان (یا ظالم ہندستان) کو جاننے کا سب سے بڑا ذریعہ مسلمانوں کے وہ "زرد اخبارات" ہیں جو اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ بچوں نے اگر اردو جان لی تو وہ اردو کے زرد اخبارات پڑھیں گے، اور پھر ان کا ذہن غیر ضروری طور پر شکایت اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہ دوسرے مسلمان بچوں کی طرح سڑکوں پر مظاہرے کریں گے اور خواہ مخواہ پولیس کی گولیاں کھائیں گے۔ اس لئے عقل مندی یہ ہے کہ اپنے بچوں کو اردو زبان سے

ناواقف رکھا جائے تاکہ وہ نہ اردو زبان کے زرد اخبارات پڑھیں اور نہ اس مفروضہ ہندستان کو جان سکیں جہاں مسلمانوں کے لئے احتجاج اور ایجی ٹیشن کے سوا کچھ اور کرنے کا موقع ہی نہیں۔ جب بانس ہی نہ ہوگا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔

یہاں میں یہ اضافہ کروں گا کہ یہ صرف ایک مسلم لیڈر کی بات نہیں، یہی تقریباً تمام مسلم لیڈروں اور رہنماؤں کی بات ہے، خواہ وہ بے ریش رہنما ہوں یا باریش رہنما۔ ان میں سے ہر ایک کا معاملہ وہی ہے جو اوپر کی مثال میں مذکورہ لیڈر کا نظر آتا ہے۔ یہ لوگ دوسروں کے سامنے الرسالہ کی مخالفت کرتے ہیں، مگر خود وہ دل وجان سے الرسالہ کو اپنا پیرومرشد بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ظاہری طور پر الرسالہ کے طریقہ کو غلط بتاتے ہیں۔ مگر اندرونی طور پر وہ اپنے بچوں کو اور اپنی زندگی کے تمام ذاتی معاملات کو الرسالہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلا رہے ہیں۔

یہی وہ دوطرفہ کردار ہے جس کو فارسی شاعر نے تمثیلی طور پر ان لفظوں میں بیان کیا تھا کہ وہ بظاہر مے کا انکار کرتے ہیں، مگر عملاً وہ خود بھی مے پرستوں ہی کے رنگ میں جیتے ہیں:

منکر مے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن

یہ تقسیم کیسی المناک ہے کہ مسلمانوں کے نام نہاد لیڈروں نے اپنے لئے زندگی کا انتخاب کیا ہے، اور عوام کے لئے موت کا۔ ایک لفظ میں یہ کہ —— جنھیں مرنا نہیں وہ للکارتے ہیں، اور جو للکارتے نہیں وہ مارے جاتے ہیں۔

کتنے ہوشیار ہیں مسلمانوں کے لیڈر، اور کتنے نادان ہیں ان کے مسلمان پیرو جو کھلے ہوئے استحصال کو دیکھتے ہیں، پھر بھی پوری وفاداری کے ساتھ ان کے پیچھے چلے جارہے ہیں۔ اتنا عجیب منظر شاید اس سے پہلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

قیادت کا دیوالیہ پن

ضبط کروں میں کب تک آہ   چل رے خامہ بسم اللہ

بابری مسجد اور رام جنم بھومی (اجودھیا) کا جھگڑا سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ تاہم اپنی موجودہ شکل میں یہ جھگڑا یکم فروری ۱۹۸۶ کو شروع ہوا جب کہ فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج، کرشن موہن پانڈے، کے عدالتی حکم کے تحت مقامی پولیس نے بابری مسجد کے دروازہ کا تالا کھول دیا جو ۱۹۴۹ سے بند چلا آرہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ عمارت عملاً ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی۔

یہ واقعہ بلاشبہ غلط تھا۔ مگر اس کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ یقینی طور پر اس سے بھی زیادہ غلط تھا۔ کیوں کہ وہ سنتِ رسولؐ کے خلاف تھا۔ قدیم مکہ میں کعبہ کے مقدس ترین خداخانہ کو بت خانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ اسی نوعیت کا سخت تر مسئلہ تھا۔ مگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے ان طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے سیاست پسند لیڈروں کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ کعبہ کے مذکورہ مسئلہ کو رسول اللہؐ نے قومی لڑائی کا عنوان نہیں بنایا، بلکہ اپنی ساری توجہ انسانی ضمیر کو جگانے پر لگا دی۔

بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد مسلمانوں نے یہ کیا کہ انھوں نے بند، گرفتاری، دھرنا، ریلی، ایجی ٹیشن، جلسوں اور تقریروں کے ہنگامے جاری کر دیئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کہ مشرکین نے خانۂ خدا میں بُت داخل کر رکھے تھے، آپ نے ان مشرکین کے دلوں میں توحید کو داخل کرنے کی مہم شروع کر دی۔ یہ طریقہ خدا کی صراطِ مستقیم کے مطابق تھا۔ چنانچہ اس کو صد فی صد کامیابی حاصل ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوتی کوششوں سے لوگوں کے سینے توحید خانے بن گیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد بھی آخر کار بُت خانہ کے بجائے توحید خانہ میں تبدیل ہو گئی۔

بابری مسجد کے معاملہ میں مسلمانوں نے جو ہنگامہ برپا کیا ہے وہ سراسر ایک قومی ہنگامہ ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ استحصال پسند لیڈروں کی پیروی میں ہے نہ کہ خدا کے پیغمبر کی پیروی میں۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو خدا کی مدد نہ مل سکی۔ ان کے ان ہنگاموں سے

معاملہ صرف نازک تر ہوتا چلا گیا ، وہ کسی بھی درجہ میں حل نہ کیا جاسکا ۔

اس معاملہ میں مسلمانوں کو کم سے کم جو کرنا تھا وہ یہ تھا کہ یکم فروری ۱۹۸۶ کے بعد بھی وہ اسی طریقہ پر قائم رہتے جس پر وہ اس سے پہلے قائم تھے ۔ یا دوسری سیکڑوں مسجدوں کے بارے میں آج بھی جس طریقہ کو وہ عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں ۔ یعنی مذکورہ غلط فیصلہ کو قانون اور گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرنا ۔ اور بالفرض اگر اس طرح کوئی حل سامنے نہ آئے تب بھی لازماً اسی پر قائم رہنا ۔ کیوں کہ یہ ہرگز عقل مندی نہیں ہے کہ کوئی شخص آپ کی ایک چیز پر قبضہ کرلے اور آپ عدالت سے انصاف نہ پارہے ہوں ، تو آپ اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلیں ۔

مسلمانوں کے استحصال پسند لیڈروں نے اس مسئلہ کو اس طرح ابھارا جیسے کہ وہ اسی کے منتظر ہوں ، انھوں نے انتہائی جذباتی تقریریں کرکے مسلمانوں کا خون گرما دیا ۔ وہ اس مسئلہ کو سڑک پر لے آئے ۔ انھوں نے اس کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ وہ پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شدید ترین قومی تناؤ کا سبب بن گیا ۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف اجودھیا کو بلکہ پورے ملک کو اشتعال کی بھٹی کے کنارے کھڑا کردیا ۔ اسی کا براہ راست نتیجہ میرٹھ اور ملیانہ کا دردناک فساد تھا ۔ ان فسادات میں لیڈر صاحبان کا تو کچھ نہیں بگڑا ، البتہ بے شمار مسلم خاندان برباد ہو کر رہ گیے ۔

مرکزی رابطہ بابری مسجد کمیٹی (بابری مسجد موومنٹ کوآرڈی نیشن کمیٹی) کے چیرمین کا ایک انٹرویو افکار ملی (۱۳ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے ۔ اس کا ایک سوال وجواب یہ ہے :

سوال ملک کے باشعور طبقوں کا کہنا ہے کہ دونوں قومیں بالمشافہ گفتگو سے مسئلہ کے کسی حل پر پہونچ سکتی ہیں ۔ کیا اس مسئلہ کو گفتگو کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی گئی ۔ (صفحہ ۲۶)

جواب لگاتار ایسی کوششیں ہوئیں اور ہر سطح پر ہوئیں ۔ لیکن ابھی تک کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلا ۔

میرے ذاتی تجربہ کے مطابق ، یہ بات سراسر خلاف واقعہ ہے ۔ کم از کم ایک بار اس قسم کی اعلیٰ سطحی میٹنگ میں میں خود شریک رہا ہوں ۔ میں نے پایا ہے کہ نام نہاد مسلم لیڈروں کا رویہ ان مواقع پر انتہائی غیر معقول ہوتا ہے ۔ ان میٹنگوں میں مسلم نمائندے بالکل وکیلانہ اور مناظرانہ بحث کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ۔ حالاں کہ نازک اور حساس مسائل میں وکیلانہ اور مناظرانہ طریقہ صرف مسئلہ کو مزید پیچیدہ بناتا ہے ، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو حل نہیں کرتا ۔

یہاں میں ایک خصوصی میٹنگ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو ہوئی تھی۔ یہ میٹنگ بابری مسجد (اجودھیا) کے مسئلہ پر تھی۔ ایک طرف بابری مسجد تحریک کے ذمہ داران تھے اور دوسری طرف ہندو شخصیتیں۔ ہندو جانب سے جو افراد شریک ہوئے، ان میں ایک ممتاز نام مہنت اویدناتھ کا ہے جو رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی کے صدر ہیں۔ راقم الحروف بھی خصوصی دعوت کے تحت اس میٹنگ میں موجود تھا۔

اس موقع پر دونوں طرف کے لوگوں نے اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔ اکثر ہندو صاحبان نے مصالحت کے انداز میں تقریر کی۔ مہنت اویدناتھ نے واضح اور متعین انداز اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ بابری مسجد ہمارے نزدیک رام جنم بھومی پر بنائی گئی ہے۔ مسجد تو آپ دوسری جگہ بھی بنا سکتے ہیں مگر جنم بھومی تو وہیں رہے گی جہاں کہ وہ ہے۔ اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ یہ جگہ ہم کو واپس دے دی جائے، تاکہ ہم اس کو اس کی ابتدائی صورت میں تعمیر کرسکیں۔ مسلم نمائندے حسب معمول اس طرح تقریر کرتے رہے جیسے کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے محض قومی وکیل بن کر اس مجلس میں شریک ہوئے ہیں۔

اجودھیا کے اس جھگڑے نے جو شدت اور نزاکت اختیار کر لی ہے، اس کے پیش نظر اس معاملہ میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ دونوں فریقوں کو فیصلہ کی ایسی مشترک بنیاد پر لایا جائے جس سے دونوں اتفاق کرسکیں۔ قومی وکالت اور جارحانہ مناظرہ والا انداز کسی بھی درجہ میں حل کا دروازہ کھولنے والا نہیں بن سکتا۔

مذکورہ میٹنگ میں جب دوسرے لوگ بول چکے تو حاضرین کے اصرار پر میں نے ایک مختصر تقریر کی۔ سب سے پہلے میں نے یہ کہا کہ مسجد کا معاملہ اسلام میں بے حد نازک ہے۔ مسجد کا مسئلہ یہ ہے کہ جو مسجد ایک بار بن جائے وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہے۔ اس کو نہ اس کی جگہ سے ہٹایا جاسکتا اور نہ کسی طرح اسے ختم کیا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسجد اگر واقعی وہ مسجد ہے تو مسلمان اپنے عقیدہ کی رو سے کبھی اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوسکتے۔

مگر اسی کے ساتھ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مسجد ایک مقدس عبادت خانہ ہے۔ اس لیے مسجد کی تعمیر لازماً جائز زمین پر ہونا چاہیے۔ اگر غصب کی ہوئی زمین پر مسجد بنائی جائے تو اسلامی فقہاء کا کہنا ہے کہ ایسی مسجد میں نماز جائز نہیں (لا تجوز فیہ الصلوٰۃ)

جہاں تک غیر مذاہب کے عبادت خانہ کو ڈھاکر اس کی جگہ مسجد بنانے کا سوال ہے، تو اصولاً یہ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ مذاہب کے عبادت خانوں کو ڈھانا، قرآن کے مطابق ایک ظالمانہ فعل ہے (الحج ۴۰) خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں شام و فلسطین کے عیسائی علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔ اس وقت ان کے لیے جو عہد نامے لکھے گیے، ان میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی درج تھا کہ ان کے مذہبی امور میں کوئی دخل اندازی نہ کی جائے گی (لا یحال بینھم وبین شرائعھم) اہل فلسطین کے معاہدہ میں یہ بھی درج کیا گیا کہ ان کے گرجا میں رہائش نہ کی جائے گی اور نہ ان کو ڈھایا جائے گا اور نہ ان میں کچھ کمی جائے گی (لا یسکن کنائسھم ولا تُھدم ولا ینتقص منھا)

ان تمہیدی باتوں کے بعد میں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کے بارے میں ہمارے سامنے دو مطالبے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مسلمان کہتے ہیں کہ یہ شروع سے مسجد ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ وہ پہلے رام جنم استھان تھی۔ بعد کو اُسے توڑ کر مسجد بنایا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ کی بنیاد کیا ہو۔

میں نے کہا کہ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ صرف دعوی اور مطالبہ کی بنیاد پر اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ فیصلہ کے لیے کسی دوسری چیز کو بنیاد بنانا پڑے گا جو ان دونوں سے الگ ہو۔ یہ دوسری چیز صرف ایک ہوسکتی ہے، اور وہ تاریخ ہے۔ اس مسئلہ کو ختم کرنے کی واحد معقول صورت یہ ہے کہ دونوں فریق اس پر راضی ہوجائیں کہ تاریخ کا جو فیصلہ ہوگا اس کو دونوں فریق بلا بحث قبول کرلیں گے۔

پھر میں نے کہا کہ آپ حضرات اگر اصولی طور پر اس بات کو مان لیں تو پھر میری تجویز ہے کہ مسلّمہ تاریخ دانوں کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ یہ بورڈ خالص تاریخی حقائق کی روشنی میں معاملہ کا جائزہ لے اور تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر وہ جس رائے پر پہونچے اس کے مطابق وہ اس کا فیصلہ کردے۔ دونوں فریق پیشگی اقرار نامہ کے مطابق، اس کے پابند ہوں کہ مذکورہ بورڈ کا جو فیصلہ ہوگا اس کو ہر دو فریق مزید بحث کے بغیر مان لیں گے۔

مزید میں نے کہا کہ اس بورڈ (یا تاریخی عدالت) میں حکومت کا بھی ایک باضابطہ نمائندہ موجود

ہو، تاکہ فیصلہ کے بعد اس کے عملی نفاذ کی یقینی ضمانت ہوسکے ۔

میری تقریر تمام لوگ بیحد غور کے ساتھ سنتے رہے۔ جب وہ ختم ہوئی تو مہنت اویدنا تھ اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم کو یہ بات منظور ہے ۔ اس انداز پر بات کو آگے بڑھایا جائے ۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا صاحب (راقم الحروف) سے میں تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کے بتائے ہوئے راہ عمل پر چلا گیا تو یہ مسئلہ خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو جائے گا ۔

بات یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ عین اس وقت بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے چیئرمین ، جو کہ ایم پی بھی ہیں ، مشتعل ہو کر چیخنے لگے ۔ وہ اتنے زور زور سے بول رہے تھے کہ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں بمشکل میں اتنا سن سکا کہ " ہم اس تجویز پر راضی نہیں ہیں "

اس گفتگو کے موقع پر جماعت اسلامی کی طرف سے بھی اس کے ایک ذمہ دار بزرگ شریک تھے ۔ مگر نا قابل فہم سبب کے تحت وہ مکمل طور پر خاموش رہے ۔ یہاں تک کہ چیئرمین صاحب کی چیخ پکار کے ساتھ میٹنگ برخواست ہو گئی ۔

میرے لیے یہ بات نا قابل فہم ہے کہ مسلم لیڈروں نے میری مذکورہ بات سے اختلاف کیوں کیا جب کہ اپنے اعلان کے مطابق ، وہ خود اسی قسم کے باعزت حل کی تلاش میں ہیں ۔ بظاہر اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ "کریڈٹ" کے مسئلہ نے انھیں اس اختلاف پر مجبور کیا ۔ وہ اپنے سیاسی مزاج کے تحت ایک ایسے حل پر راضی نہ ہو سکے جس کا کریڈٹ ان کے سوا کسی اور کو مل رہا ہو ۔

مسٹر گووند مکھوٹی (صدر دہلی بار ایسوسی ایشن) نے بابری مسجد کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے :

" اس قضیہ کا فیصلہ کسی بھی عدالت میں نہیں ہو سکتا ۔ اس کے لیے آسان صورت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ کے روشن خیال لوگ خلوص دل سے اس مسئلہ کا حل نکالنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں اور تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کا فیصلہ کریں " افکار ملی ، ۳۱ مئی ۱۹۸۸ ، صفحہ ۳۷

اس میں شک نہیں کہ اس معاملہ میں یہی سب سے زیادہ قابل عمل بات ہے ۔ جس قضیہ سے عوامی جذبات اتنے زیادہ وابستہ ہوں یا وابستہ کر دیئے جائیں ۔ اس کو محض عدالتی حکم کے ذریعہ ختم نہیں کیا جا سکتا ۔ یکم فروری ۱۹۸۶ کو فیض آباد کی عدالت نے ایک حکم دیا تھا ۔ مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ ہندوؤں

نے اس کو مانا، اور مسلمانوں نے اس کو نہیں مانا۔ اسی طرح کوئی دوسری عدالت اس سے مختلف حکم دے تو مسلمان اس کو مانیں گے مگر ہندو اس کو نہیں مانیں گے۔ اور پھر مسئلہ جہاں تھا وہیں باقی رہے گا۔

ایسے ہی نازک اجتماعی معاملات کے لیے حکَم اور ثالث کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔ یہ "عدالت" کی وہ قسم ہے جس میں دونوں فریق پیشگی اقرار کے ذریعہ اس پر راضی ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کے فیصلہ کو مانیں گے، خواہ وہ ان کے موافق ہو یا ان کے خلاف۔ اوپر ہم نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی مشترک میٹنگ کی جو روداد درج کی ہے، وہ بتاتی ہے کہ ڈیڑھ سال پہلے یہ مسئلہ مکمل طور پر اس قسم کے ایک باعزت حل کے قریب پہونچ گیا تھا۔ یہ گویا "تاریخ کی عدالت" کو حکَم بنانے کے ہم معنی تھا۔ مگر انھیں سیاست باز لیڈروں نے اس حل کو واقعہ بننے نہیں دیا جو اس مسئلہ کو حل کرنے کے نام پر لیڈری کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے دوڑ لگا رہے ہیں۔

مرکزی رابطہ بابری مسجد کمیٹی کے چیئرمین صاحب کا ایک انٹرویو افکار ملی (۳۱ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس کا ایک سوال و جواب یہ ہے:

سوال تحریک بازیابی بابری مسجد کی اب تک کی کارکردگی کے بارہ میں آپ کا کیا تبصرہ ہے۔

جواب دو سال میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آج ملک کے ایجنڈے پر بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔ حکومت آخری دم تک اس کو مقامی مسئلہ کہتی رہی ہے۔ لیکن آج حکومت تسلیم کرتی ہے کہ یہ ملکی مسئلہ ہے۔ اس طرح ہم اسے ملکی سطح پر لے آئے۔

یہ بلاشبہ صرف ایک غیر سنجیدہ لفاظی ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ آج ملکی ایجنڈے پر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ آج ملکی تشدد کی فہرست پر ہے۔ اس تحریک نے ایک مقامی نزاع کو ایک ملکی نزاع بنا دیا ہے۔ عام حالت میں جو چیز صرف ایک قصبہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تناؤ کا سبب بن سکتی تھی، اس کو پورے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کا سبب بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "چیئرمین صاحب" نے جس چیز کو اپنی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا ہے، وہی اس کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔

"اجودھیا" اور "رام جنم بھومی" ہندو عقیدہ کے مطابق ان کے مقدس مقامات ہیں۔ وہ ہندو قوم کے لیے انتہائی حساس اشو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے نازک اور حساس سوال کو مقامی کش مکش

کے دائرہ سے نکال کر ملکی کشمکش کے دائرہ میں لانا، مجرمانہ حد تک ایک غلط فعل ہے۔ مزید یہ کہ یہ اصل مسئلہ کے حل میں رکاوٹ بھی ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے ملک کے ہندوؤں کو اپنی مخالفت پر کھڑا کر دیا جائے۔ دور جمہوریت میں اس توسیع کے معنی کیا ہیں، اس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔

میں ذاتی طور پر دہلی کی کم از کم نصف درجن مسجدوں کو جانتا ہوں جو ۱۹۴۷ کے بعد اغیار کے قبضہ میں چلی گئی تھیں۔ بعض مسلمانوں کے دل میں ان کا درد پیدا ہوا۔ خوش قسمتی سے یہ لوگ لیڈر نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے خالص مقامی انداز میں اس کی بازیابی کی کوشش شروع کی۔ انھوں نے نہ جلسہ جلوس کی دھوم مچائی۔ اور نہ اخبارات میں بیانات شائع کیے۔ بس خاموش انداز میں دفتری اور قانونی کارروائی کرتے رہے۔ انھیں اس کام میں مقامی ہندوؤں کا بھی موثر تعاون ملا۔ ان میں سے کئی مسجدوں کا رقبہ بابری مسجد سے بہت زیادہ بڑا تھا۔ مگر یہ تمام مسجدیں مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جذباتی تقریریں کرکے ایک مسجد کو مقامی اشو کے بجائے ملکی اشو بنانا سستی لیڈری حاصل کرنے کی کوشش تو ہو سکتی ہے، مگر وہ مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش ہرگز نہیں۔

اجودھیا کی بابری مسجد تحریک کے "چیرمین" کے جس انٹرویو کا ذکر اوپر ہوا، اس کا ایک حصہ یہ ہے:

سوال کیا مسلم قائدین اجودھیا مارچ میں شریک ہوں گے، یا مسلم قائدین گھر میں بیٹھیں گے اور عوام مارچ میں نقصان اٹھائیں گے۔

جواب ترتیب پر منحصر ہے۔ میں نے تو کوئی ایسی فوج نہیں دیکھی جس میں جنرل بھی آگے جاکر لڑتا ہے۔ کسی کا یہ کہنا احمقانہ ہے کہ صرف قائدین آگے چلے جائیں۔ یا یہ کہنا کہ محض عوام ہی آگے رہیں قائدین آگے نہ آئیں (افکار ملی، ۱۳ مئی ۱۹۸۸، صفحہ ۲۴)

بابری مسجد ریلی (۳۰ مارچ ۱۹۸۷) کے بعد سے بار بار مارچ (کوچ) کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے نام نہاد قائدین کی میٹنگیں ہوتی تھیں، مگر ہر بار تاریخ کا تعین کیے بغیر میٹنگ برخواست ہو جاتی تھی۔ عام لوگ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ مارچ کی تاریخ کا تعین اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے کہ مارچ کے پرخطر اقدام میں لیڈر کو آگے رہنا پڑے گا۔ اور لیڈر صرف ملت کے بچوں کو یتیم بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے، وہ اپنے بچوں کو یتیم بنانا نہیں چاہتا۔

مگر مذکورہ سوال و جواب بتاتا ہے کہ لیڈر کے سیاسی ذہن نے غالباً اس مشکل کا حل دریافت کر لیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ اگر مارچ ہو تو لیڈر مارچ کا "جنرل" بن جائے۔ وہ مارچ سے دور کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کر مارچ کی رہنمائی کرے۔ مگر اس قسم کی جھوٹی ہوشیاری لیڈر صاحبان کے کام آنے والی نہیں۔ کیوں کہ ہر شخص جانتا ہے کہ جنرل ایک منظم فوج کو دوسری منظم فوج سے لڑاتا ہے۔ جب کہ مارچ (کوچ) اس قسم کی لڑائی نہیں۔ مارچ اصلاً ایک مظاہرہ ہے۔ اور مظاہرہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک لیڈر کی گاڑی اس کے آگے آگے نہ چل رہی ہو۔

اجودھیا مارچ کا فیصلہ نام نہاد مسلم لیڈروں نے بوٹ کلب ریلی کے موقع پر ۳۰ مارچ ۱۹۸۶ کو کیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل مسلمانوں کے جذبات اس عنوان پر ابھارے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ فیض آباد کی میٹنگ (۲۲ مئی ۱۹۸۸) میں "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" کے ذمہ داروں نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو طویل مارچ کرکے اجودھیا پہونچیں گے اور ہر قیمت پر بابری مسجد میں داخل ہو کر جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ کل ہند بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر (جو کہ ایم پی بھی ہیں) نے ایک پریس کانفرنس میں اس فیصلہ کا اعلان کیا (قومی آواز، ۲۳ مئی ۱۹۸۸)

یہ فیصلہ بلاشبہ مجنونانہ حد تک غلط ہے۔ اس قسم کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو لیڈری کی ہوس میں اندھے ہو چکے ہوں۔ اور انھیں اپنی لیڈری کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہ دیتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی نام نہاد قیادت نے بابری مسجد کے بارہ میں جوش دلا کر مسلمانوں کو اب ایک ایسے نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ان کے ایک طرف گہری کھائی ہے اور دوسری طرف خونخوار بھیڑیا۔

اب ظاہر ہے کہ صرف دو امکان ہے۔ یا تو بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے اعلان کے مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو اجودھیا مارچ ہو، یا اجودھیا مارچ نہ ہو۔ تاہم دونوں میں سے جو بات بھی ہو گی وہ یقینی طور پر سنگین ترین نتائج پیدا کرے گی۔ موجودہ صورت حال میں جب کہ دونوں طرف کے لوگوں کے جذبات انتہائی حد تک بھڑکا دیئے گیے ہیں، دونوں میں سے کوئی بات بھی سادہ بات نہیں ہو سکتی۔

اگر مذکورہ اعلان کے مطابق، مسلمانوں کا جتھا مارچ کرتے ہوئے اجودھیا پہونچتا ہے اور بابری مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کو نہایت خونخوار مزاحمت

کا سامنا کرنا ہوگا۔ تقریباً یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ حالات میں اس قسم کا اقدام میرٹھ اور ملیانہ سے بھی زیادہ بُرے انجام کی طرف جان بوجھ کر چھلانگ لگانے کے ہم معنی ثابت ہوگا۔ سطحی قسم کے قائدین اس کے بعد "ظلم اور سازش" کے انکشاف میں سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر یقینی طور پر یہ مسلم قیادت کے دیوالیہ پن کا ثبوت ہوگا نہ کہ کسی دوسرے کے ظلم اور سازش کا۔

اور اگر لیڈر کا زرخیز دماغ کوئی عذر نکال کر اجودھیا مارچ کو ملتوی یا منسوخ کر دے تو یہ بلاشبہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کی ریلی میں مسلم مقررین نے جس طرح فریق ثانی کو دھمکیاں دی تھیں، اس کے بعد سے اب تک تمام چھوٹے بڑے مسلم قائدین جس طرح چیلنج کی زبان میں بات کرتے رہے، جس طرح جلسوں کی بھیڑ میں بابری مسجد لے کے رہیں گے جیسے "فلک شگاف" نعرے لگائے جاتے رہے، اس کے بعد مارچ کا التوا محض سادہ واقعہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں نے الفاظ کے بے پناہ اسراف سے جو ملکی فضا بنائی ہے، اس کے بعد اگر وہ اقدام سے باز رہتے ہیں تو یہ فریق ثانی کی نظر میں سخت ترین بزدلی کا مظاہرہ ہوگا جس کی تلافی مستقبل بعید تک بھی ناممکن ہوگی۔ اس کے بعد وہ ذلت اور حقارت کے ایسے دور میں داخل ہو جائیں گے جس کا اب تک انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نااہل قیادت نے ہندستانی مسلمانوں کو اب ایسے نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ان کے لیے انتخاب (Choice) بربادی اور غیر بربادی میں نہیں ہے، بلکہ ایک بربادی اور دوسری بربادی میں ہے۔ شاید عربی شاعر نے اسی قسم کی نکمّی قیادت کے بارہ میں یہ شعر کہا تھا کہ جب کوّا کسی قوم کا سردار ہو جائے تو وہ ان کو ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گا:

اِذَا کَانَ الْغُرَابُ رَئِیسَ قَوْمٍ
سَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی دَارِ الْبَوَارِ

یہاں ہم ہفت روزہ نئی دنیا (۳-۹ جون ۱۹۸۸) کا ایک پیراگراف نقل کریں گے۔ اس نے اجودھیا مارچ کے مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے "خودکشی یا جہاد" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"کیا حق ہے اور کیا ناحق، اس سے قطع نظر، آج کے ہندستان کی حقیقت یہ ہے کہ فاشسٹ اور فرقہ پرست عناصر اس مارچ کے سوال کو لے کر ہندستان کے امن و امان کو آگ لگانے کی کوشش کریں گے۔ سید شہاب الدین یا بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے کچھ لیڈر کتنی بھی من شانتی کی بات کریں اور گاندھیائی

انداز میں مارچ کرنے کا نعرہ لگائیں، عام آدمی کے ذہن میں اس مارچ کا مطلب ہندو مسلم ٹکراؤ ہوگا، جو فاشسٹ طاقتیں ہندستان سے سیکولزم کا جنازہ نکالنا چاہتی ہیں، مارچ کو بہانہ بناکر گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ فساد کرانے اور ہنگامے کرانے کی سازشیں کریں گی۔ جس طرح میرٹھ کے قتل عام کے موقع پر مسلم قیادت بے دست و پا نظر آرہی تھی، اسی طرح اس موقع پر بھی خاموش تماشائی بنی نظر آئے گی، اور کٹے گا، مرے گا، لٹے گا عام مسلمان، غریب مسلمان، بدحال، بے بس مسلمان۔ مارچ کے اس فیصلہ کے ساتھ مسلم لیڈروں کو اس بات کو سامنے رکھنا ہوگا کہ ان کا موقف کتنا بھی درست کیوں نہ ہو، ان کی حکمت عملی کے نتائج کیا ہوں گے۔ اور یہ نتائج کسے بھگتنے ہوں گے۔ اور سب سے بڑی بدنصیبی تو یہ ہوگی کہ ان سب قربانیوں کے باوجود اس راستہ کو اپناکر مسلمانوں کو بابری مسجد نہیں مل سکے گی۔ خود بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے قائد بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔" صفحہ ۱

تیر بہدف نسخہ

بابری مسجد تحریک کی نام نہاد قیادت نے پرجوش تقریروں کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے ۱۲ اگست ۱۹۸۸ کو "قائدین کا مارچ" ہوگا۔ وہ فیض آباد سے چل کر اجودھیا پہونچیں گے اور بابری مسجد میں فاتحانہ داخل ہوکر جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ اس اعلان کا ردعمل فریق ثانی پر ہوا۔ اور ہندو فرقہ پرست تنظیمیں پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ مسلم قائدین نے اگر مذکورہ تاریخ کو اجودھیا مارچ کیا تو ہم سوگنا طاقت کے ساتھ ان کی طرف مارچ کریں گے۔ پہلے بظاہر یہ دکھائی دیتا تھا کہ اجودھیا کی طرف مارچ قیادت کی طرف مارچ ہے۔ مگر بعد کو نظر آیا کہ اجودھیا مارچ قبرستان کی طرف مارچ ثابت ہوگا۔ چنانچہ نام نہاد قائدین نے ایک عذر نکال کر مارچ کو ملتوی کر دیا۔

اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ یہ مارچ ضرور ہوگا اور اب اس کی تاریخ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ہے۔ بار بار اعلان کیا گیا کہ مارچ مذکورہ تاریخ کو ہوکر رہے گا۔ کسی بھی وجہ سے وہ رکنے والا نہیں۔ مگر اس کے بعد انتہا پسند ہندو عناصر نے اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ مجوزہ اجودھیا مارچ کو نہ صرف بزور روکیں گے بلکہ وہ مارچ میں شرکت کرنے والوں کو ایسا "سبق" پڑھائیں گے کہ آئندہ وہ اس قسم کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔ اب قائدین کو اپنے سامنے موت نظر آنے لگی۔ چنانچہ دوبارہ بالکل آخر وقت میں اس کے التوا کا اعلان کر دیا گیا ——— لفظ کا کریڈٹ لینے والے عمل کا کریڈٹ لینے میں ناکام رہے۔

اس سلسلہ میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مارچ کے بھیانک نتائج سے مسلم قائدین تو بچ گیے مگر مسلم عوام اس سے بچنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ پورے یو پی میں ان کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز علی گڈھ، مظفر نگر، کھتولی اور فیض آباد وغیرہ میں باقاعدہ فسادات پھوٹ پڑے جن میں مسلمانوں کو ناقابل بیان جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک ہی مشترک خطرہ سے قائدین تحریک کس طرح مکمل طور پر بچ گیے، اور پیروانِ تحریک کیوں کر عین اسی خطرہ کا شکار ہوگیے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ قائدین کا اصول

یہ ہے کہ لفظی تقریریں کرو، مگر جب عمل کا وقت آئے تو ایک خوبصورت عذر بیان کرکے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ اس کے برعکس پیروان تحریک اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جو تقریر کی جائے اس کے مطابق عمل بھی ضرور کیا جائے۔

ایسی حالت میں میں مسلم عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے قائدین کی ادھوری پیروی کرنے کے بجائے ان کی مکمل پیروی کریں۔ مسلم عوام اگر چاہتے ہیں کہ جس طرح ان کے قائدین کی جان و مال پوری طرح محفوظ ہے اسی طرح ان کی اپنی جان و مال بھی پوری طرح محفوظ رہے تو اس کا نہایت سادہ سا حل یہ ہے کہ —— قائدین کے کیے کو کرو، ان کے کہے کو بالکل نظر انداز کر دو۔

علی گڈھ کی مثال

فرقہ وارانہ فساد کی حقیقت کیا ہے اور اس سے کس طرح بچا جاسکتا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے علی گڈھ کی مثال لیجئے۔ علی گڈھ کے مسلمان قائدین تحریک کے لفظوں سے (نہ کہ عمل سے) متاثر ہو کر بابری مسجد تحریک کے مسئلہ پر زبردست جوش و خروش دکھا رہے تھے۔ اس کے جواب میں وہاں کے ہندو بھی پوری طاقت سے ابھر آئے۔ ۸ اکتوبر کو بجرنگ دل، ہندو پریشد اور رام جنم بھومی مکتی سنگھرش سمتی کی جانب سے یک روزہ علامتی ہڑتال ریاست گیر پیمانہ پر ہوئی۔ ایسے نازک مواقع پر مسلم قائدین اپنا "مارچ" ملتوی کر دیتے ہیں مگر علی گڈھ کے مسلمانوں نے اس کے برعکس اپنا "مارچ" جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ تناؤ اور اشتعال بڑھتا چلا گیا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو صبح ۹ بجے سے آر ایس ایس کے رضا کار اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ہوئے تمام شہر کی دکانوں کو زبردستی بند کرا رہے تھے۔ ریلوے روڈ، سبزی منڈی اور بڑا بازار میں انھوں نے مسلم اقلیت کی دکانوں کو بھی طاقت کے بل پر بند کرا دیا۔ تاہم صرف دکانوں کو بند کرانے سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بند دکانوں کے اوپر بینر لگا دیئے جن پر علی گڈھ کے بجائے "ہری گڈھ" لکھا ہوا تھا۔

مسلمانوں کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ انھوں نے ان بینروں کو اپنی دکانوں سے اتار دیا۔ اب بجرنگ دل اور آر ایس ایس کے رضا کاروں کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی کارروائی کریں۔ اور مسلمانوں نے بینر اتار کر وہ کارروائی کر دی۔ چنانچہ فوراً وہ تخریب کاری پر اتر آئے۔ چند منٹوں کے اندر خنجر زنی، لوٹ مار، آتش زنی اور فائرنگ کا

ہنگامہ برپا ہو گیا ۔ اس فساد میں مسلمانوں کو جان و مال کا جو نقصان اٹھانا پڑا اس کی تفصیل قومی آواز کی رپورٹ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۸ میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

ہندو فرقہ پرستوں کے ان "کاغذی" بینروں کو مسلمان اگر اپنی دکانوں کے اوپر سے خود نہ اتارتے تو یقینی طور پر ہوا کے جھونکے انھیں اتار دیتے ۔ قدرت کا نظام زیادہ بہتر طور پر وہ کام کر دیتا جس کو مسلمان نہایت کم تر انداز میں انجام دینا چاہتے تھے ۔ مگر مسلمان اپنی بے شعوری اور نظام خداوندی کے بارہ میں اپنی بے یقینی کی بنا پر اس کا انتظار نہ کر سکے کہ قدرت کی طاقتیں متحرک ہو کر جھنڈوں اور بینروں کے اس کوڑے کو صاف کریں ۔ انھوں نے مشتعل ہو کر خود یہ کام کرنا چاہا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتہائی غیر ضروری طور پر آگ اور خون کی نذر کر دیئے گئے ۔

ہندستان کے فسادات کے سلسلہ میں اصل مسئلہ مسلمانوں کی یہی مشتعل مزاجی ہے نہ کہ اغیار کی اشتعال انگیزی ۔ کیوں کہ مقابلہ کی اس دنیا میں اشتعال انگیزی کے واقعات تو بہر حال ہوں گے ، اور وہ ہندستان ہی میں نہیں ، بلکہ ہر جگہ ہوں گے ، حتیٰ کہ مسلم ملکوں میں بھی ۔ ہم ان کے وجود کو ختم نہیں کر سکتے ۔ البتہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو ان کے نقصان سے بچا سکتے ہیں ۔ اور وہ تدبیر ہے ——— اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا ۔

مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی یہی بے صبری ہے ۔ فریق ثانی نے اچھی طرح جان لیا ہے کہ کچھ چیزیں ہیں جن پر مسلمان فوراً بھڑک اٹھتے ہیں ۔ ہر مسلمان کا کوئی "ہری گڈھ" ہے ۔ جب بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ہو ، فوراً "ہری گڑھ" کا نعرہ لگا دو ۔ اس کے بعد لازماً ایسا ہو گا کہ مسلمان بھڑک اٹھیں گے اور پھر ان کے خلاف متشددانہ کارروائی کرنے کا موقع مل جائے گا ۔ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان "ہری گڑھ" پر بھڑکنا چھوڑ دیں ، اس کے بعد تمام فسادات بے زمین ہو کر اپنے آپ ختم ہو جائیں گے ۔

یقینی حل

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کا بلاشبہ یقینی حل ہے ۔ مگر یہ حل "انتظامیہ" کے پاس نہیں ہے ۔ یہ خود مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے ۔ مسلمان جس روز اس حقیقت کو جان لیں گے ، اسی دن اس ملک سے فرقہ وارانہ فسادات اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا ۔

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ (Competition) کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک دوڑ رہا ہے۔ ہر ایک دوسرے کا پیچھا کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں لازماً ٹکراؤ کے مواقع پیش آتے ہیں۔ مذکورہ قانون فطرت کی بنا پر وہ ہمیشہ اور ہر جگہ پیش آئیں گے خواہ وہ دسویں صدی ہو یا بیسویں صدی، خواہ وہ ہندستان ہو یا پاکستان۔ غرض کہیں بھی مقابلہ اور مسابقت کی یہ حالت ختم ہونے والی نہیں۔ ہم مقابلہ کی حالت کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم اپنے آپ کو اس کی زد سے بچا سکتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کا واحد نسخہ وہی ہے جس کو قرآن میں اعراض (Avoidance) کہا گیا ہے۔

ہندستان کے ہندو فرقہ پرستوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی ایک کمزوری دریافت کر رکھی ہے۔ یہ کمزوری ہے ان کا اشتعال کے موقع پر مشتعل ہو جانا۔ جن مواقع پر قرآنی حکم کے مطابق اعراض کرنا چاہیے وہاں دوسروں سے الجھ جانا۔ یہ گویا مسلمانوں کا کمزور مقام (Vulnerable point) ہے۔ اسی کمزور مقام سے فریق ثانی ان پر "حملہ" کرتا ہے اور مسلمانوں کی بے شعوری کی بنا پر ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔

ایک واقعہ

ایک صاحب نے ایک شہر کا واقعہ بتایا جو ۱۹۸۸ میں پیش آیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے شہر میں ہندو فرقہ پرست عناصر نے تین روزہ جلسہ کیا۔ اس میں ایک بہت بڑا بک اسٹال بھی رکھا گیا تھا۔ اس اسٹال پر دوسرے دل آزار لٹریچر کے ساتھ ستیارتھ پرکاش اور رنگیلا رسول جیسی کتابیں بھی رکھی گئیں۔ مسلمانوں نے ان کتابوں کو دیکھا تو ان کے اندر سخت غصہ اور اشتعال پیدا ہوا۔ انھوں نے فوراً ایک جوابی جلسہ کیا جس میں تقریباً ۵ ہزار مسلمان شریک ہوئے۔ مقررین نے پر جوش تقریریں کیں۔ پورا مجمع غصہ اور اشتعال سے بھر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ یہاں سے اٹھ کر سیدھے ہندوؤں کے اجتماع میں جائیں گے اور وہاں شامیانہ کو توڑیں گے اور کتابوں کو جلا ڈالیں گے۔

عین اس وقت ایک سنجیدہ مقرر اسٹیج پر آیا اس نے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ یہ تقریر مسلمانوں کے مجمع پر ٹھنڈی بارش بن کر برسی۔ اور ہندو اجتماع کے لیے ایک ایسا شعلہ ثابت ہوئی جس نے براہ راست مداخلت کے بغیر ان کے سارے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔

مقرر نے کہا کہ اپنی بات کو میں علامہ اقبال کے ایک لطیفہ سے شروع کرتا ہوں۔ اس لطیفہ کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور اس سے واقعۃً سبق لے سکیں تو وہ آپ کے لیے اس قسم کے تمام فسادات اور شرارتوں کا بہتر بہدف علاج ہے۔

لاہور میں علامہ اقبال کے محلہ میں زیادہ عمر کے ایک صاحب تھے جو اکثر علامہ اقبال سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے پوچھا کہ چڑھونی کی حقیقت کیا ہے۔ کیسے ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی ایک لفظ (مثلاً کریلا) سے چڑھنے لگے۔ علامہ اقبال نے اس سوال کا کوئی براہ راست جواب نہیں دیا یہاں تک کہ وہ صاحب واپس چلے گیے۔

اگلے دن علامہ اقبال نے اپنے ملازم کو ان صاحب کے گھر یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ ان سے آم کا اچار مانگ لاؤ۔ ملازم نے جا کر ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ نکلے تو اس نے کہا کہ علامہ اقبال نے آم کا اچار مانگا ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر ملازم کو رخصت کر دیا کہ میرے پاس آم کا اچار نہیں ہے۔ دو گھنٹہ کے بعد علامہ اقبال نے دوبارہ ملازم سے کہا کہ ان کے یہاں جاؤ اور آم کا اچار مانگ لاؤ۔ ملازم گیا اور دوبارہ ان کو علامہ اقبال کا پیغام پہونچایا۔ انھوں نے کسی قدر تیزی کے ساتھ کہا کہ میں نے تم کو بتا دیا کہ میرے پاس آم کا اچار نہیں ہے۔ علامہ اقبال ہر دو گھنٹہ کے بعد اس آدمی کو مذکورہ صاحب کے پاس آم کا اچار مانگنے کے لیے بھیجتے رہے اور ملازم ہر بار سخت تر لہجہ میں مذکورہ صاحب کا جواب لے کر واپس آتا رہا۔

یہاں تک کہ آخری بار جب ملازم ان کے یہاں گیا تو ان کی شدت غصہ میں تبدیل ہوگئی۔ انھوں نے آستین چڑھا کر ڈنڈا اٹھایا اور ملازم کو مارنے کے لیے دوڑے۔ اب ملازم آگے آگے بھاگ رہا ہے اور وہ صاحب ڈنڈا لیے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔

محلہ کے لڑکوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کو تجسس پیدا ہوا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ پوچھ گچھ کرنے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ یہ آم کے اچار کا قصہ تھا۔ اب "آم کا اچار" مذکورہ صاحب کی چڑھونی بن گئی۔ اور محلہ کے لڑکوں کو بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ صاحب جب بھی گھر سے باہر نکلتے، لڑکے ان کے پاس آکر کہتے "آم کا اچار"۔ یہ کہہ کر لڑکے بھاگتے اور وہ بزرگ لڑکوں کے پیچھے دوڑتے۔ آخر تنگ آکر انھوں نے یہ کیا کہ وہ ڈنڈا لے کر باہر نکلنے لگے۔ جب بھی وہ گھر سے نکلتے ان کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا

ضرور ہوتا۔ لڑکے آم کا اچار کہہ کر بھاگتے اور یہ ڈنڈا اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے دوڑتے۔ اسی حالت میں ایک روز ایسا ہوا کہ تیز بھاگتے ہوئے وہ ایک گڑھے میں گر پڑے اور ان کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مہینوں کے علاج کے باوجود ان کی ہڈی درست نہ ہوسکی۔ جس ڈنڈے کو انھوں نے لڑکوں کو مارنے کے لیے بنایا تھا۔ وہ ان کی سہارے کی لاٹھی بن گئی جس کو ٹیک کر وہ چلتے تھے۔ وہ اسی حالت پر باقی رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

مقرر نے مسلمانوں کے مذکورہ جلسہ میں جب یہ لطیفہ سنایا تو مسلمانوں کا جوش اچانک ہنسی میں تبدیل ہوگیا۔ مقرر نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ فریق ثانی نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ کچھ چیزوں کو ہماری چڑھونی بنالیا ہے۔ مثلاً خاص طرح کے نعرے لگانا، خاص طرح کے مضامین شائع کرنا، وغیرہ وہ لوگ ہم کو چڑھاتے ہیں اور ہم چڑھ جاتے ہیں۔ اگر ہم شعوری طور پر اس بات کو جان لیں کہ فریق ثانی جو کچھ کرتا ہے وہ در اصل چڑھونی کا معاملہ ہے اور چڑھونی کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اگر چڑھے تو وہ چڑھونی ہے، اور اگر نہ چڑھے تو اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ وہ ایسا پٹاخہ ہے جو پھسپھسا کر رہ گیا۔

میں مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ یہ طے کرلیں کہ فریق ثانی خواہ آپ کو کتنا ہی چڑھائے اور خواہ کیسی ہی چڑھونی آپ کے خلاف استعمال کرے، آپ کسی حال میں بھی نہیں چڑھیں گے۔ آپ ہمیشہ ایسی چیزوں سے اعراض کرکے گزر جائیں گے۔ اگر آپ ایسا کریں تو یقینی ہے کہ فسادات کی ساری عمارت دھڑام سے گر جائے گی۔

فسادات کے خلاف اس تیر بہدف نسخہ کا پہلا کامیاب تجربہ خود مذکورہ شہر میں ہوا۔ وہ مسلمان جو اپنے جلسہ گاہ سے اٹھ کر فریق ثانی کے جلسہ میں جاتے۔ وہاں ان کی کتابوں کو جلاتے اور پھر زیادہ بڑے پیمانہ پر خود جلائے جاتے، ان کا موڈ بالکل بدل گیا۔ ایک کہانی جو المیہ پر ختم ہوتی وہ اچانک طربیہ کی صورت میں بدل گئی۔

اس کے بعد مسلمان ٹھنڈے ہوکر سیدھے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مسلمانوں کا اس طرح لوٹنا فریق ثانی کے جلسہ پر بجلی بن کر گرا۔ مسلمانوں نے ان کی کتابوں سے کوئی دل چسپی نہیں لی اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، وہ پہلے ہی اس کو خریدنے والے نہ تھے۔ ان کا وسیع پنڈال بھی آدمیوں سے خالی

رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین دن کا اجتماع دو ہی دن میں ختم ہو گیا۔ تمام کتابیں اور تمام دل آزار لٹریچر غیر فروخت شدہ حالت میں گاڑیوں میں لاد کر واپس گیا تاکہ دوبارہ ردی خانہ میں جا کر فروخت ہو۔

یہ فسادات کو ختم کرنے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ یہ یقینی طور پر ہر قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کا قاتل ہے۔ میری رائے ہے کہ مسلمان اس واقعہ کو آڈیو ٹیپ یا ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کر کے تیار رکھیں اور جہاں بھی فرقہ وارانہ فساد کا اندیشہ ہو فوراً وہاں پہونچ کر وہاں کے لوگوں کو سنائیں یا اس کی تصویریں دکھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد فسادات کا سلسلہ اس طرح ختم ہو جائے گا جیسے جلتی آگ پر پانی ڈالا جائے اور وہ بجھ کر رہ جائے۔

حقیقت بے نقاب

بابری مسجد کی بازیابی کے لئے "اجودھیا مارچ" کی تحریک طوفان کی طرح اٹھی اور غبارہ کی طرح پھٹ گئی۔ بظاہر یہ ایک المناک حادثہ تھا۔ تاہم اطمینان کی بات یہ ہے کہ جو غبارہ پھٹا، وہ نام نہاد مسلم قیادت کا غبارہ تھا۔ ملت ابتدائی طور پر قائدین کا ساتھ دینے کے بعد آخر کار ان سے الگ ہوگئی، اور اس طرح وہ ان قائدین کے فتنہ سے بچ گئی جو اس کو حوالہ آتش کر کے اپنے جھوٹے قیادتی چہرہ کو روشن کرنا چاہتے تھے۔

بابری مسجد کا قضیہ بہت پرانا ہے۔ وہ تقسیم (۱۹۴۷) کے قبل سے چلا آرہا ہے۔ تاہم پرامن تدبیر کے دائرہ سے نکل کر ایجی ٹیشن کے دائرہ میں داخل ہونے کا دور ۱۹۸۷ کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔ کچھ نام نہاد مسلم لیڈروں نے بابری مسجد کی بازیابی کے نام پر ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کو ریپبلک ڈے کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ یہ اس معاملہ میں غیر پرامن انداز اختیار کرنے کا آغاز تھا۔ تاہم یہ لغو اقدام اخباری گرمی پیدا کرنے کے بعد آخر وقت میں واپس لے لیا گیا۔

اس کے بعد ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو "لاکھوں" مسلمانوں کی ریلی نئی دہلی (بوٹ کلب) میں جمع ہوئی۔ یہاں نہایت اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں اور "بابری مسجد لیکے رہیں گے" جیسے پرجوش نعرے لگائے گئے۔ (ملاحظہ ہو الرسالہ نومبر ۱۹۸۸، صفحہ ۲۴) لیڈروں نے اپنی دھواں دھار تقریروں کے دوران اعلان کیا کہ وہ مارچ کر کے اجودھیا جائیں گے اور مسجد میں فاتحانہ داخل ہو کر وہاں جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۸۷ کی میٹنگ میں دو مارچ کا فیصلہ کیا گیا:

۱. قائدین کا منی مارچ ۱۲ اگست ۱۹۸۸

۲. مسلم عوام کا لانگ مارچ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸

اعلان کے مطابق دونوں مارچ فیض آباد سے شروع ہو کر اجودھیا کی بابری مسجد پر ختم ہونے والا تھا۔ پہلا مارچ تقریباً پانچ سو کی تعداد میں قائدین اور مسلم نمائندوں پر مشتمل ہوتا اور دوسرے مارچ میں سارے ملک کے مسلم عوام لاکھوں کی تعداد میں فیض آباد میں جمع ہوتے اور وہاں سے یلغار کرتے ہوئے اجودھیا پہنچتے اور بابری مسجد میں داخل ہو جاتے۔

مگر عملاً نہ منی مارچ ہوسکا اور نہ لانگ مارچ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادھر مسلم قائدین کی طرف سے اجودھیا مارچ کا اعلان ہوا۔ دوسری طرف رام جنم بھومی سنگھرش سمتی، بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد جیسی انتہا پسند ہندو تنظیمیں متحرک ہوگئیں۔ مسلمانوں کے چیلنج نے ان کو نئی زندگی دے دی۔ انھوں نے کھلے طور پر کہنا شروع کیا کہ اگر مسلمانوں نے اجودھیا مارچ کیا تو انھیں اجودھیا پہنچنے سے پہلے کچل دیا جائے گا۔ اس کے بعد مسلم قائدین کی طرف سے یہ بہانہ نکال کر ۱۲ اگست کے مارچ کو ملتوی کر دیا گیا کہ مرکزی حکومت اس معاملہ میں دلچسپی لے رہی ہے، اور وہ دونوں فریقوں سے بات چیت کرکے اس مسئلہ کا ایسا حل نکالنا چاہتی ہے جو دونوں فریقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

قومی آواز (۲۷ ستمبر ۱۹۸۸) کی رپورٹ کے مطابق، ۲۶ ستمبر کو نئی دہلی میں بابری مسجد تحریک کی مرکزی رابطہ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ رابطہ کمیٹی نے موجودہ حالات کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو لاکھوں مسلمانوں کا جو عوامی مارچ ہونے والا تھا، اس کو ابھی ملتوی کر دیا جائے۔ البتہ اسی تاریخ (۱۴ اکتوبر) کو قائدین تحریک کا وہ مارچ ہوگا جو اس سے پہلے ۱۲ اگست ۱۹۸۸ کو کیا جانا طے تھا۔

بابری مسجد تحریک کے نام نہاد لیڈر مسلسل یہ اعلان کرتے رہے کہ "اجودھیا مارچ ضرور ہوگا" مثلاً قومی آواز (۸ اکتوبر ۱۹۸۸) کے مطابق، بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے کنوینر نے اعلان کیا کہ "مارچ کو ملتوی کرنے یا ختم کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ "رابطہ کمیٹی نے وزیر اعلیٰ اترپردیش نرائن دت تیواری سے تحریری درخواست کی ہے کہ وہ مارچ میں حصہ لینے والے مسلم رہنماؤں کو تحفظ مہیا کریں" (قومی آواز، ۸ اکتوبر ۱۹۸۸، صفحہ ۱)

بابری مسجد تحریک کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی طرف سے ایک اخباری اعلان اس مضمون کا شائع ہوا کہ:

"کچھ اخباروں کے ذریعہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اجودھیا مارچ، جس میں ملک کے طول و عرض سے رضاکار حصہ لینے والے ہیں، ملتوی ہوگیا ہے۔ اجودھیا مارچ ملتوی نہیں ہوا ہے، اور اس کی تاریخ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ہے۔ تمام ریاستی و ضلع اور شہر ایکشن کمیٹیوں سے اپیل ہے کہ وہ اجودھیا مارچ کی تیاری جاری رکھیں۔ محلے محلے، مسجد مسجد، رضاکاروں کا اندراج جاری رہے۔ اور قصبہ بہ قصبہ، محلہ بہ محلہ ٹولیاں بنائی جائیں۔ اور ان کے مصارف سفر کے لئے وسائل جمع کئے جائیں۔ ریل یا بس

سے فیض آباد ۱۳ اکتوبر تک پہنچنے کا پروگرام بنایا جائے۔" (سہ روزہ دعوت ، یکم اکتوبر ۱۹۸۸)

بابری مسجد تحریک کے قائدین ۱۴ اکتوبر سے پہلے مسلسل یہی خبر نشر کرتے رہے کہ اجودھیا مارچ ۱۴ اکتوبر کو ضرور ہوگا، وہ ختم یا ملتوی ہونے والا نہیں۔ اس طرح کے اعلانات اور تقریروں نے کٹر ہندوؤں کو مزید ابھارا۔ انھوں نے مارچ کو ناکام کرنے کے لئے جوابی منصوبہ بنانا شروع کیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے مجوزہ مارچ سے پہلے ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو یوپی میں ایک بند منایا۔ یہ بند مجوزہ اجودھیا مارچ کے خلاف تھا۔ اس موقع پر جگہ جگہ اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ اس کے نتیجہ میں تناؤ بڑھا اور یوپی کے کئی مقامات (مظفر نگر، علی گڑھ، بہرائچ، جھانسی کھتولی، فیض آباد، گوپال گنج وغیرہ) میں فساد ہوگیا۔ اس میں بہت سے مسلمانوں کی جانیں گئیں اور انھیں زبردست مالی نقصانات ہوئے۔

نام نہاد قائدین کی طرف سے بدستور یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ اجودھیا مارچ ضرور ہوگا۔ اسی کے ساتھ بار بار حکومت سے یہ مطالبہ بھی جاری تھا کہ وہ مارچ میں حصہ لینے والوں کے لئے تحفظ فراہم کرے۔ مگر حکومت نے تحفظ کی یقین دہانی کرنے سے عملاً انکار کر دیا۔ اس کے برعکس حکومت نے کہا کہ آپ لوگ اپنا مارچ ملتوی کر دیں۔ ہم دونوں فریقوں سے بات چیت کر کے کسی متفقہ حل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

مسلم قائدین بار بار یہ اعلان کر چکے تھے کہ اجودھیا مارچ مجوزہ تاریخ کو ضرور ہوگا، وہ کسی بھی حال میں رکنے والا نہیں۔ مگر ایک طرف انھوں نے دیکھا کہ حکومت ان کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ایسی حالت میں مارچ کرنا، اپنے آپ کو فریق ثانی کی جارحیت کے حوالے کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

دوسری طرف ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو ہندوؤں کی کٹر جماعتوں نے جو بند منایا، اس کے نتیجہ میں یوپی کے مختلف علاقوں میں خوں ریز فسادات ہوئے۔ نیز اسی قسم کے دوسرے سخت اسباب نے ظاہر کر دیا کہ اب اگر اجودھیا مارچ کیا جاتا ہے تو اس کے خلاف تشدد کا ہونا یقینی ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر خود مسلم عوام بھی مارچ میں اپنی دلچسپی کھو چکے تھے۔ موت کے اس سفر میں شرکت کرنے کے لئے وہ پرجوش نہیں رہے تھے۔

واضح علامات کی بنا پر قائدین نے محسوس کیا کہ موجودہ حالات میں اگر وہ مارچ کرتے ہیں تو انھیں مسلم

عوام کی حمایت حاصل نہ ہوسکے گی۔ وہ دوطرفہ طور پر بے یارومددگار ہوکر رہ جائیں گے۔ چنانچہ مسلم قائدین نے دوبارہ عافیت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اجودھیا مارچ کی تاریخ سے ایک دن پہلے اس کے التوا (صحیح تر لفظ میں خاتمہ) کا اعلان کر دیا۔

التوا کی آزمودہ تدبیر اختیار کر کے مسلم قائدین نے اپنی جان بچالی۔ مگر ۸ اکتوبر کے بندھ کے نتیجہ میں جو تشدد پیدا ہوا اس میں سیکڑوں مسلم خاندان بربادی کا شکار ہوکر رہ گئے۔ بابری مسجد کا مسئلہ بدستور شدید تر انداز میں باقی رہا۔ وہ مسلمانوں کی قبروں کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہ کرسکا۔

اجودھیا مارچ کی تاریخ سے کچھ پہلے میں نے ایک عام قسم کے مسلمان سے پوچھا: کیا اجودھیا مارچ ہوگا اس نے جواب دیا: "مولانا صاحب، جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔" مطلب یہ تھا کہ اب جب کہ اجودھیا مارچ کرنا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے تو کون ہوگا جو جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے گڑھے میں ڈالے۔

مسلم عوام شروع میں اپنی سادگی اور ناسمجھی کی بنا پر "قائدین تحریک" کے ساتھ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قائدین کے جلسوں کی بھیڑ بڑھا کر وہ بابری مسجد کے مسئلہ کو حل کرلیں گے۔ مگر آخر میں انھیں نظر آیا کہ قائدین کی حقیقت پرشور ڈھول کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ بابری مسجد کی طرف اقدام کرنے سے وہ صرف اپنے جان و مال کو کھوئیں گے، اصل مسئلہ جیسا ہے بدستور ویسا ہی پڑا رہے گا۔ اس قسم کا مارچ صرف ملت کی بربادی میں اضافہ کرے گا نہ کہ اس کی آبادی میں۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد، اگرچہ تاخیر سے، مسلم عوام مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ گئے۔ ان کے رویہ سے صاف ظاہر ہوگیا کہ مارچ ہونے کی صورت میں وہ "قائدین تحریک کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اب "قائدین تحریک" اپنے آپ کو میدان میں اکیلا پا رہے تھے۔" لاکھوں عوام" کی مفروضہ بھیڑ دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی جو ان کی تقریروں پر نعرہ لگائے اور اس طرح ان کی شان قیادت میں اضافہ کرے۔ بے بسی اور تنہائی کا یہ منظر دیکھ کر انھوں نے الفاظ کا ایک مجموعہ مرتب کیا اور اس کو اخبار میں بھیج کر راتوں رات مارچ کے التوا کا اعلان کر دیا۔

یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ یہ لطیفہ اجودھیا مارچ کے نعرہ پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے۔ مدینہ کے سفر (مارچ ۱۹۸۴) میں میری ملاقات ایک فلسطینی نوجوان سے ہوئی۔ ان کا نام مصطفیٰ شاور تھا۔ وہ

تعلیم کی غرض سے مدینہ میں مقیم تھے اور نہایت دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔

مصطفی شاور نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک حاکم تھا۔ اس کا ایک اونٹ تھا جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اور کھیتوں اور باغوں میں بہت نقصان کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ پریشان ہوکر اپنے خطیب (امام مسجد) کے پاس گئے اور کہا کہ اس کا کچھ علاج کیجئے۔ خطیب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ تم سب جمع ہوکر میرے ساتھ چلو۔ میں حاکم کی قیام گاہ پر پہنچ کر اس کو بلاؤں گا۔ جب حاکم باہر آئے گا تو بس بلند آواز سے کہوں گا: یا حاکم جَمَلَكَ (اے حاکم تمہارا اونٹ) اس کے جواب میں تم لوگ پیچھے سے آواز لگانا: اِمْنَعْہُ عَنَّا (اس کو ہم سے روک دے)

خطیب صاحب روانہ ہوئے اور جوش میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ شروع میں گاؤں کے لوگ بھی ان کے پیچھے تھے۔ مگر ساتھ ہی ان پر حاکم کا خوف طاری تھا۔ چنانچہ ایک ایک کرکے وہ راستہ میں چھٹنے لگے۔ یہاں تک کہ سب کے سب خاموشی سے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ آخر میں خطیب صاحب کے سوا کوئی اور باقی نہ رہا۔ خطیب صاحب جوش میں بڑھتے ہوئے حاکم کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں دروازہ کھٹکھٹایا۔ حاکم باہر آیا تو اس کو دیکھ کر خطیب صاحب نے حسب قرارداد بلند آواز سے کہا: یا حاکم جملک۔ ان کا خیال تھا کہ گاؤں والے ان کے پیچھے ہیں اور وہ سب مل کر امنعہ عنا کا نعرہ لگائیں گے۔ مگر ان کی امیدوں کے خلاف پیچھے سے کوئی آواز نہ آئی۔ وہ بار بار۔ یا حاکم جملک کہتے رہے مگر پیچھے کوئی نہ تھا جو اس دوسرے جملہ کو دہرائے۔ حاکم نے پوچھا کہ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اب خطیب صاحب نے پیچھے مڑکر دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس صورت حال سے وہ گھبرا اٹھے۔ انھوں نے اپنے سابقہ نعرے کو بدل دیا اور حاکم سے کہا: یحتاج الی الناقة (وہ اونٹنی چاہتا ہے) یہ کہا اور فوراً واپس روانہ ہوگئے۔

تقریباً یہی حال بابری مسجد کی بازیابی کے لئے اجودھیا مارچ کے نعرہ کا ہوا ہے۔ نام نہاد قائدین نے اعلان کیا تھا کہ وہ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے دو مارچ (۱۲ اگست، ۱۴ اکتوبر) کریں گے۔ انھوں نے اپنی پرجوش تقریروں میں کہا تھا کہ ملک بھر سے لاکھوں مسلمان "بابری مسجد لے کے رہیں گے" کا نعرہ لگاتے ہوئے اجودھیا پہنچیں گے اور بابری مسجد میں فاتحانہ داخل ہوکر وہاں جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔

اس کے بعد حالات میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ اجودھیا مارچ لوگوں کو خونی مارچ دکھائی دینے لگا۔ مسلمان عام طور پر یہ کہنے لگے کہ اجودھیا مارچ تو موت کی طرف مارچ ہے۔ ہم کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو مروائیں۔ اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کرنے کے لئے بے فائدہ اجودھیا مارچ کریں۔

اب قائدین تحریک کا وہی حال ہوا جو مذکورہ امام کا ہوا تھا۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو انھیں "لاکھوں کا مجمع" کہیں دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے نعرہ کو بدل دیا۔ اب وہ اجودھیا مارچ کی اپیل کرنے کے بجائے مسلمانوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ مسجدوں میں جاکر دعا کرو۔ مسلمان تو صرف خدا کی طرف مارچ کرنے والا ہوتا ہے، انسانوں کی طرف مارچ کرنے سے اسے کیا کام۔

اس میں میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ قائدین اگر یہی بات شروع سے کہتے تو یقیناً ان کے الفاظ کی قیمت تھی مگر اب ان کے ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں۔ اب اس قسم کے الفاظ ان کی بدترین نا اہلی کا اشتہار ہیں، نہ کہ ان کی اہلیت اور لیاقت کا ثبوت۔

میری ڈائری میں ۱۴ فروری ۱۹۸۶ کے تحت یہ الفاظ درج ہیں :

آج جمعہ کا دن تھا۔ بابری مسجد تحریک کے لیڈروں کی پکار پر آج "یوم بابری مسجد" منایا گیا دہلی اور یوپی کی مسجدوں میں پرجوش تقریریں ہوئیں۔ میں نے آج دہلی کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ امام صاحب آج معمول سے زیادہ پرجوش نظر آرہے تھے۔ وہ بلند آواز سے تقریباً چیخنے کی زبان میں بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا :

" ہم اپنی گردنیں کٹوا دیں گے۔ ہمارے اوپر چاہے ٹینک چلا دئے جائیں اور توپ کے گولے برسائے جائیں، مگر ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہماری مسجدوں پر قبضہ کیا جائے اور ان کی بے حرمتی کی جائے۔" وغیرہ وغیرہ۔

نماز کے بعد مسجدوں سے جلوس نکالے گئے۔ لال کنواں (دہلی) میں جلوس نے شدت اختیار کرلی۔ پولیس نے گولی چلائی جس سے دو مسلم نوجوان مر گئے۔ اسی طرح یوپی کے بعض اور مقامات پر گولی چلی اور مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

ایک دن کے لئے ہنگامہ کرنے اور یک طرفہ نقصان اٹھانے کے بعد مسلمان خاموش ہوگئے۔ اور "بابری مسجد" بدستور "رام جنم بھومی مندر" بنی رہی۔

اس دن کا تجربہ دیکھ کر میری زبان پر ایک جملہ آگیا تھا جو بعد کو الرسالہ ستمبر ۱۹۸۶ کے سرورق پر شائع ہوا۔ وہ جملہ یہ تھا ——— بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے۔

قربانی کے نام پر بربادی

بابری مسجد کی بازیابی کے لئے نام نہاد قائدین کی تحریک اپنے اصل مقصد میں تو ایک فی صد بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ مگر اس نے مسلمانوں کے لئے انتہائی سنگین مسائل پیدا کر دئے۔ ایک مسلم اخبار نے "دہشت کے مارے مسلمان" کے عنوان کے تحت لکھا ہے: "پورا ملک فرقہ واریت کی گھناؤنی آگ کی لپیٹوں میں ہے۔ نفرت، غصہ، انتقام اور کشیدگی سے مل کر جو ماحول بن رہا ہے، اس نے معصوم، بے قصور اور امن پسند انسانوں کے لئے باعزت اور باہمت طور پر زندہ رہنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بنا دیا ہے (ہجوم، ۱۸-۲۴ نومبر ۱۹۸۸)

یہ حالات اگرچہ سخت افسوسناک ہیں۔ مگر ان کا مثبت فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پہلی بار حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنا شروع کیا ہے۔ اب وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان حالات کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خود اپنے آپ پر ہے۔ ان حالات کو پیدا کرنے والے وہ نام نہاد مسلم لیڈر ہیں جو قربانی کے نام پر مسلمانوں کو بربادی کی راہوں میں دوڑاتے رہے۔

ماضی میں جذباتی سیاست کی نمائندگی کرنے والے ایک مسلم اخبار نے لکھا ہے کہ "اس میں قصور کچھ ہمارا بھی ہے۔ ہم بھی جذبات سے مغلوب ہوگئے۔ ہمارے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ نہیں رہا۔ ہم نے مسئلہ کو تدبیر کے بجائے جذباتی انداز سے حل کرنے کی غلطی کی ..... یہ جدو جہد اشتعال انگیز بیانات اور تقریروں سے سر ہونے والی نہیں .... "چڑھ جا بیٹے سولی پر" کا عمل سودمند ثابت ہونے والا نہیں (ندائے ملت، ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸)

یہ اطمینان کی بات ہے کہ جذباتی سیاست کے سنگین نتائج دیکھنے کے بعد مسلمان اب اس سے دور ہونا چاہتے ہیں۔ "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" اور "چڑھ جا بیٹے سولی پر" جیسے نعروں پر احمقانہ قربانی کے ایک سو سال ضائع کرنے کے بعد اب ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔ یہ نیا طرز فکر انھیں نام نہاد قائدین سے دور کرے گا، اور قائدین سے دوری ہی کا دوسرا نام منزل سے قریب ہونا ہے۔

الٹا نتیجہ

بابری مسجد کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک مکمل طور پر الٹا نتیجہ برآمد کرنے والی ثابت ہوئی ہے۔ اس کا یہ خطرناک نتیجہ نکلا ہے کہ ہندوؤں کے کٹر عناصر پہلے سے زیادہ طاقت ور ہوکر باہم متحد ہوگئے ہیں اور مسلمانوں کے لئے سنگین ترین خطرہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

۱۳ نومبر ۱۹۸۸ کا واقعہ ہے۔ میں بھوپال ایرپورٹ پر دہلی کی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ بھوپال کے ایک باشندہ مسٹر راج تیواری (عمر ۵۰ سال) نے اپنا ایک ذاتی تجربہ مجھے بتایا۔ وہ بزنس کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں ۲۲ اگست ۱۹۸۸ کو ویسٹ بنگال کے شہر بانکورا (Bankura) جانا پڑا۔ وہاں وہ پشپک ہوٹل میں ٹھہرے، اس کے بغل میں ایک مندر تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ مندر کے اوپر ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے:

ضلع شیوسینا کاریالیہ، پچھمی بنگال

راج تیواری صاحب نے کہا کہ میں اس بورڈ کو دیکھ رہا تھا کہ تقریباً ۷۰ سال کا ایک بوڑھا بنگالی وہاں آگیا۔ راج تیواری صاحب چونکہ بنگلہ زبان جانتے تھے اس لئے اسی زبان میں اس سے گفتگو ہوئی۔ بنگالی نے پوچھا کہ کیا دیکھ رہے ہو۔ راج تیواری صاحب نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ مندر کے بازو میں یہ بنا کیسی۔ بنگالی نے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے، انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتایا۔ اس کے بعد بنگالی نے کہا کہ اندر آؤ۔ وہ راج تیواری صاحب کو اندر ایک کمرہ میں لے گیا جو دفتر کی مانند تھا اور کچھ لوگ وہاں کام کر رہے تھے۔ اس بنگالی کا نام پنکج مکرجی تھا۔

یہاں دیوار پر بہت سے ہندو لیڈروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مثلاً شیواجی، رانا پرتاپ، ساورکر، ہیڈگوار، وغیرہ۔ یہ تمام تصویریں دو فٹ چوڑی اور دو فٹ لمبے سائز میں تھیں۔ ان کے درمیان ایک زیادہ بڑی قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی جو دو فٹ چوڑی اور چار فٹ لمبی تھی۔ بقیہ تصویریں نصف حصۂ جسم کی تھیں مگر بڑی تصویر سر سے پاؤں تک پورے قد کی تھی۔

راج تیواری صاحب نے غور کرکے اس تصویر کو پہچانا تو وہ سید شہاب الدین کی تصویر تھی۔ انھوں نے مذکورہ بنگالی سے پوچھا کہ سید شہاب الدین کی تصویر یہاں کیوں لگی ہوئی ہے۔ وہ تو آپ کے دشمن ہیں۔ مذکورہ بنگالی نے جواب دیا کہ بیٹے، یہ ہمارا دیوتا ہے۔ جو کام ہمارے دوسرے لیڈر ہزار

سال میں بھی نہ کر سکے، اس کو بھگوان شہاب الدین نے ڈیڑھ سال میں کر دیا۔ سیکڑوں سال سے سوئے ہندو کو شہاب الدین نے ڈیڑھ سال میں جگا دیا۔ ہم تو ان کا مندر بنائیں گے اور ان کی پوجا کریں گے۔

مسٹر راج تیواری نے یہ قصہ ۱۳ نومبر کی شام کو ۳ بجے مجھے بھوپال ایئرپورٹ پر لکھوایا اور اس کے نیچے اپنے دستخط کئے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ کوئی شخص اس بات کو خود اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہے تو وہ میرے ساتھ بانکورہ چلے۔ میں اس کو یہ چیز وہاں دکھاؤں گا۔

اطلاعات بتاتی ہیں کہ مسٹر راج تیواری کی یہ رپورٹ انوکھی نہیں۔ چنانچہ ہفت روزہ ندائے ملت (لکھنؤ) نے اپنے اداریہ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸ میں لکھا ہے کہ "ایک بڑے ہندو لیڈر کے گھر ان کے ایک ہندو دوست گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ شہاب الدین صاحب کی ایک بڑی تصویر دیوار پر لگی ہوئی ہے۔ پھول کی مالا بھی چڑھا رکھی ہے۔ ان کے ہندو دوست کو سخت تعجب ہوا کہ شہاب الدین کی فوٹو اس گھر میں کیسے۔ انھوں نے بہت تعجب سے پوچھا کہ یہ فوٹو آپ کے یہاں کیسے۔ انھوں نے جواب دیا کہ شہاب الدین ہمارا محسن ہے۔ اس نے ہندو قوم کو متحد کر دیا۔ دراصل یہی ہوا۔"

ایسے کھلے ہوئے نشانات ظاہر ہونے کے بعد بھی اگر مسلمان اپنے دوست اور اپنے دشمن کو نہ پہچانیں تو ان سے زیادہ نادان قوم دنیا میں اور کوئی نہ ہوگی، نہ حال میں اور نہ ماضی میں۔

قرآن وسنت کی رہنمائی

اسلام کے نزدیک تمام مسجدیں یکساں ہیں، خواہ کوئی چھوٹی مسجد ہو یا کوئی بڑی مسجد، خواہ وہ کسی معمولی آدمی کی بنوائی ہوئی ہو یا کسی بادشاہ کی بنوائی ہوئی۔ اس میں صرف تین مسجدوں کا استثناء ہے۔ بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف تین مسجدیں ہیں جن کے لیے سفر کرنا درست ہے۔ مکہ کی مسجد حرام، مدینہ کی مسجد نبوی، اور فلسطین کی مسجد اقصیٰ (لاتشدُّ الرحال الآ الیٰ ثلاثۃ مساجد: المسجد الحرام، ومسجد الرسول، المسجد الاقصیٰ۔ وفی روایۃٍ: انما یُسافَرُ الی ثلاثۃ مساجد۔ مسجد الکعبۃ ومسجدی ومسجد ایلیاء)

اس حدیث کی تشریح محدثین نے یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے تقرب کی نیت سے کسی مقام کا قصد نہیں کیا جائے گا، سوا ان تین مقامات کے، ان کی عظمت اور شرف کی وجہ سے (المراد لا یُقصد موضع من المواضع بنیۃ العبادۃ والتقرب الی اللّٰہ تعالیٰ الا الیٰ ھذہ الاماکن الثلاثۃ تعظیما لشانھا وتشریفًا)

معلوم ہوا کہ مذکورہ تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے اسلام میں شدِّ رحال کی اجازت نہیں ہے۔ یہ امتیازی حیثیت صرف تین مسجدوں کو حاصل ہے کہ خاص اس میں عبادت کرنے کے مقصد سے آدمی وہاں کا سفر اختیار کر سکتا ہے۔ دوسری تمام مسجدوں میں عبادت کا ثواب یکساں ہے، جیسا ایک مسجد میں ویسا ہی دوسری مسجد میں۔ البتہ مذکورہ تین مسجدوں میں عبادت کا ثواب استثنائی طور پر زیادہ ہے۔ ان تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی نہ کوئی امتیازی حیثیت ہے اور نہ ان کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے خصوصی طور پر عبادتی سفر کرنا جائز ہے۔

مذکورہ شرعی حکم "عبادتی سفر" کے لیے ہے۔ اب اگر کچھ مسلمان ایک عام مسجد کی طرف کفن بردوش ہو کر سفر کریں۔ وہ کہیں کہ ہم جو مارچ کر رہے ہیں وہ عبادتی مارچ نہیں ہے۔ ہم تو مسجد کے غاصبوں سے مسجد کو واگذار کرنے کے لیے ان کے اوپر پرامن جمہوری چڑھائی کر رہے ہیں، تو یہ اور بھی زیادہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ ایک مسجد کے لیے عبادتی شدِّ رحال اگر بدعت ہو، تو غیر مسلح

مسلمانوں کا اس کے مسلح غاصبوں سے ٹکرانے کے لیے اقدام کرنا سراسر حرام ہے۔

اگر نارمل حالات ہوں اور سفر کے ساتھ جان و مال کے نقصان کا اندیشہ وابستہ نہ ہو تب بھی تین مسجدوں کے سوا کسی مسجد کے لیے شدّ رحال جائز نہیں۔ لیکن اگر غیر معمولی حالات ہوں اور سفر کرکے مسجد تک پہونچنے میں مسلمانوں کی جان و مال کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو تو اس وقت معاملہ مزید نازک ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں فضیلت والی مسجدوں کے لیے سفر کرنا بھی غیر مطلوب بن جائے گا، اور دوسری مسجدوں کی طرف پرخطر مارچ کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

جہاں تک اس دوسرے معاملہ کی نوعیت کا سوال ہے، اس کی مثال ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتی ہے۔ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہونچ کر عمرہ ادا کریں۔ آج کل کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے مکہ کی طرف پرامن مارچ کیا۔ یہ مقدس قافلہ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام تک پہونچا تھا کہ مکہ کے منکرین نے آپ کو آگے بڑھنے سے روکا۔ وہ آپ سے لڑنے کے لیے تیار ہو گیے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی سواری حدیبیہ کے مقام پر روک دی (حبسہا حابس الفیل) اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے اعراض فرمایا اور قریش کی شرط کے مطابق، عمرہ ادا کیے بغیر درمیان ہی سے مدینہ کی طرف واپس چلے گیے۔

قدیم عرب میں "غیر تحریری دستور" یہ تھا کہ کسی کو زیارت کعبہ سے روکا نہ جائے۔ مگر قریش اس کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے آپ کو زیارتِ کعبہ سے روکنے پر تل گیے۔ اب ایک طرف صورت دستوری تھی جو آپ کے موافق تھی اور دوسری طرف صورتِ واقعی تھی جو آپ کے خلاف ہو گئی تھی۔ آپ نے صورتِ دستوری کا کوئی حوالہ نہیں دیا بلکہ صورتِ واقعی کو اصل سمجھتے ہوئے اس کے مطابق عمل فرمایا ——— پیغمبرانہ حکمت حقیقتِ واقعہ کو اپنے موافق بنانا ہے نہ کہ "دستور" کے نام پر بے فائدہ لفظی جنگ لڑنا۔

جس وقت مذکورہ واقعہ پیش آیا اس وقت حرم کعبہ میں ۳۶۰ بُت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحاب رسول کو یہ حکم نہیں دیا کہ تم توحید کے گھر کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے ہر قیمت پر مکہ میں داخل ہو جاؤ۔ اگر اس وقت تم خاموش ہو گیے تو کافروں کے حوصلے

بڑھ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ دوسری تمام مسجدوں کو بھی اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کریں گے اور ان کو اپنے بتوں سے بھر دیں گے۔ اس نازک موقع پر اس قسم کا "مجاہدانہ" حکم نہ آنا ثابت کرتا ہے کہ اس قسم کی مصلحت اللہ تعالیٰ کی نظر میں غیر معتبر ہے۔ وہ کوئی حقیقی اور معتبر مصلحت نہیں، اس لیے مسلمانوں کو ایسی مصلحتوں کا لحاظ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

مکہ کی طرف مارچ سے روکنے کی حکمت کیا تھی، وہ واضح طور پر قرآن کی ۴۸ ویں سورۃ الفتح میں بیان کی گئی ہے۔ متعلقہ آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اور اللہ ہی ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے روک دیا، مکہ کی وادی میں۔ بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دیدیا تھا۔ اور اللہ دیکھ رہا تھا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ وہی ہیں جنھوں نے انکار کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی کہ وہ اپنی جگہ تک نہ پہونچیں۔ اور اگر ایسے مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم لاعلمی میں روند ڈالتے، پھر ان کے باعث تم پر بے خبری میں الزام آتا (تو ہم جنگ کی اجازت دیدیتے) تاکہ اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اور اگر وہ لوگ الگ ہوگیے ہوتے تو ان میں جو منکر تھے، ان کو ہم دردناک سزا دیتے (الفتح ۲۴-۲۵)

مولانا شبیر احمد عثمانی سورہ فتح کی مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یعنی ان کی شرارتیں اور تمہارا عفو و تحمل سب کچھ اللہ دیکھ رہا ہے ---- کچھ مسلمان مرد و عورت جو مکہ میں مظلوم و مقہور تھے اور مسلمان ان کو پوری طرح جانتے نہ تھے، وہ لڑائی میں بے خبری سے پیس دیئے جائیں گے۔ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو فی الحال لڑائی کا (اور مکہ میں داخلہ کا) حکم دیدیا جاتا۔ لیکن ایسا ہوتا تو تم خود (مسلمانوں کی ہلاکت کے) اس قومی نقصان پر متاسف ہوتے۔ اس خرابی کے باعث لڑائی (اور مکہ میں داخلہ) موقوف رکھا گیا تاکہ وہ مسلمان محفوظ رہیں اور تم پر اس بے مثال صبر و تحمل کی بدولت خدا اپنی رحمت نازل فرمائے۔ نیز کافروں میں سے جن لوگوں کا اسلام لانا مقدر ہے، ان کو بھی لڑائی کی خطرناک گڑبڑ سے بچا کر اپنی رحمت میں داخل کرے" صفحہ ۶۶۷

حدیبیہ (۶ھ) کا واقعہ اور اس کے بارے میں قرآن کا مذکورہ ارشاد بتا رہا ہے کہ مسجد حرام میں بتوں کی موجودگی اور اس پر کافروں کے ناجائز قبضہ کے باوجود، اللہ تعالیٰ نے

اس کی طرف " مارچ " کرنے کا حکم نہیں دیا۔ مذکورہ آیت میں اس کی دو خاص وجہ بتائی گئی ہے۔

۱۔ مکہ کی طرف عمرہ کی ادائیگی کے لیے " مارچ " کرنا اگرچہ بظاہر ایک سادہ واقعہ تھا مگر اس وقت اہل مکہ کے درمیان اشتعال کی جو فضا عملاً بن گئی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یہ یقینی تھا کہ " مارچ " کو جاری رکھنے میں مسلمانوں کا اہل مکہ سے غیر ضروری ٹکراؤ ہوگا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے بے قصور مسلمان ناحق مارے جائیں گے۔ مسلمان کا خون بے حد قیمتی ہے۔ اس کو بچانا ہر دوسری مصلحت پر فوقیت رکھتا ہے۔

۲۔ ٹکراؤ سے بچنے کی دوسری مصلحت یہ بتائی کہ جن لوگوں سے تمہارا جنگی ٹکراؤ ہوتا وہ اگرچہ بظاہر تمہارے اور اسلام کے دشمن تھے مگر ان میں بہت سے ایسے افراد تھے جن کے اندر قبولیت حق کی فطری استعداد موجود تھی۔ ان کے متعلق امید تھی کہ آیندہ جب ضد کی فضا ختم ہوگی تو وہ اپنے معاملہ پر نظر ثانی کریں گے اور ایمان قبول کر کے تمہارے ساتھی اور حمایتی بن جائیں گے۔ ایسے لوگوں کی اشتعال انگیزی پر ان سے لڑنا نہیں ہے بلکہ اشتعال کو نظر انداز کر کے ایسے حالات پیدا کرنا ہے کہ ان پر دعوتی عمل جاری کیا جا سکے۔ جن لوگوں کو دعوت کے ذریعہ مسخر کرنے کا موقع ہو ان کو دشمن کے خانہ میں ڈال کر ان کے خلاف لڑائی چھیڑنا اسلام میں ہرگز جائز نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت دو قسم کے مسئلے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ موحد اعظم حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد میں سیکڑوں بت رکھ دیے گیے تھے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لیے اس میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اس دستوری حق کو حاصل کرنے اور مسجد کو بتوں سے پاک کرنے کی مہم چلانے میں بیک وقت دو نقصان تھا ــــــ مسلمانوں کا قتل و خون اور متوقع مومنین سے محرومی۔ آپ نے اس وقت یہ کیا کہ پہلے مسئلہ کو دوسرے مسئلہ کے تابع کر دیا۔ آپ نے دوسرے مسئلہ کی فوری رعایت فرمائی اور پہلے مسئلہ کو مستقبل کے خانہ میں ڈال دیا۔

یہ تدبیر نہایت موثر ثابت ہوئی۔ ۶ھ میں دوسرا مسئلہ حل ہوا، اور ۸ھ میں پہلا مسئلہ۔ آپ حال کے بھی مالک بن گیے اور مستقبل کے مالک بھی۔ یہ پیغمبر کا طریقہ ہے۔ اور پیغمبر کے طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ میں کامیابی اور نجات نہیں۔

بربادی کے رہنما

ہفت روزہ نئی دنیا (۲۹ جولائی - ۴ اگست ۱۹۸۸) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے "اہم قائدین" لکھنؤ کے ایک بزرگ عالم سے ملے۔ قائدین نے ان سے اجودھیا مارچ کے بارہ میں تفصیلی گفتگو کی۔ مطبوعہ رپورٹ کے مطابق، مذکورہ عالم نے واضح طور پر کہا کہ اجودھیا مارچ کوئی فقہی مسئلہ نہیں ہے جس پر کسی فتویٰ کی ضرورت ہو یا اس کی کوئی اہمیت ہو۔ "بابری مسجد رابطہ کمیٹی نے مولانا موصوف سے اس سلسلہ میں ان کی رائے طلب کی تھی۔ لیکن مولانا نے صاف کہہ دیا کہ اس مسئلہ پر کسی فتویٰ کی ضرورت نہیں، یہ ایک غیر فقہی مسئلہ ہے۔" صفحہ ۳

۱۔ فقہ علم شریعت کا نام ہے۔ اور اجودھیا مارچ، ذمہ داروں کے اعلان کے مطابق، یہ ہے کہ مسلمان جلوس بنا کر بڑی تعداد میں اجودھیا جائیں اور وہاں بابری مسجد کے اندر جمعہ کی نماز پڑھیں۔ اب یہ ناقابل فہم ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس کا تعلق مسجد اور نماز سے ہو، اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ فقہی اور شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ اس معاملہ میں شریعت سے رہنمائی لینے کی ضرورت نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شریعت جو چودہ سو سال سے استنجا اور طہارت تک کے معاملات میں مسلمانوں کی رہنما بنی ہوئی تھی، اب وہ مسجد اور نماز کے معاملہ میں بھی رہنمائی دینے سے عاجز یا غیر متعلق ہو گئی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس معاملہ کو دورِ پریس کی اُس مخلوق کے حوالے کر دیں جس کو عام طور پر سیاسی لیڈر (صحیح تر لفظ میں سیاسی تاجر) کہا جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک انتہائی عجیب واقعہ ہے جو مسلمانوں کی لمبی تاریخ میں شاید اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔

۲۔ قائدینِ تحریک کے اعلان کے مطابق، اجودھیا مارچ یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے مسلمان سفر کر کے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو اجودھیا پہونچیں اور وہاں بابری مسجد میں داخل ہو کر نماز جمعہ ادا کریں۔ یہ منصوبہ واضح طور پر اس فرمانِ رسول کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دنیا کی صرف تین مسجدیں ہیں جن کے لیے شدِّ رحال جائز ہے، ان کے سوا کسی اور مسجد کے لیے جائز نہیں۔ حدیث میں جن تین استثنائی مسجدوں کا نام لیا گیا ہے، ان میں اجودھیا کی بابری مسجد یقینی طور پر شامل نہیں ہے، اس لیے اس کے واسطے عبادتی شدِّ رحال بھی جائز نہیں ہو سکتا (ملاحظہ ہو الرسالہ اگست ۱۹۸۸)

معلوم ہوا کہ نماز کی ادائیگی کے لیے دور کے بیرونی مقامات سے کوچ کر کے اجودھیا جانا اور وہاں کی بابری مسجد میں نماز ادا کرنے کی کوشش کرنا صراحۃً حدیثِ رسول سے ٹکراتا ہے۔ اور جب کوئی عمل قرآن اور حدیث سے ٹکرائے تو یہی ٹکراؤ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ ایک شرعی نوعیت کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ایسے معاملہ میں شریعت سے رہنمائی حاصل کریں، اور جو قدم اٹھائیں شریعت کی مطابقت میں اٹھائیں ۔

۳۔ اجودھیا مارچ کسی خالی جزیرہ کی طرف مارچ نہیں ہے۔ وہ ایسے مقام کی طرف مارچ ہے جہاں پہلے سے ایک طاقت ور فریق موجود ہے۔ اگر یہ مارچ ہوتا ہے تو ایک طرف مسلمان ہوں گے جو جلوس کی صورت میں سفر کر کے وہاں پہونچیں گے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو بابری مسجد پر غاصبانہ قبضہ کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے لیڈروں نے بار بار اعلان کیا ہے کہ مسلمان مکمل طور پر غیر مسلّح حالت میں اجودھیا جائیں گے۔ دوسری طرف قبضہ کرنے والے ہیں جن کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ وہ مقررہ تاریخ کو تربیت یافتہ نوجوانوں کے دستے بہت بڑی تعداد میں اجودھیا میں اور اجودھیا کے باہر متعین کر دیں گے جو مسلمانوں کو بجبر بابری مسجد تک جانے سے روکیں گے۔ اور اگر مسلمان پھر بھی نہ مانیں تو وہ ان کو کچل کر رکھ دیں گے۔

اس قسم کے غیر مساویانہ مارچ کے لیے کسی شاعر کی شاعری یا کسی خطیب کی خطابت میں تو جواز مل سکتا ہے، مگر قرآن و سنّت میں اس کے لیے کوئی جواز نہیں۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے مخالفین سے مقابلہ کے وقت بچاؤ کا اہتمام کرو (النساء ۱۷) اسی طرح قرآن میں حکم ہے کہ ایسی قوت فراہم کرو جو تمہارے دشمنوں کو ہیبت زدہ کر دینے والی ہو (الانفال ۶۰) ان احکام کی روشنی میں دیکھئے تو مجوزہ مارچ اپنی موجودہ صورت میں خدائی ہدایات کے بالکل خلاف ہے۔ کیوں کہ وہ ضروری تیاری کے بغیر کیا جانے والا ہے، وہ عملی طور پر نہتی مسلم اقلیت کو ہتھیار بند غیر مسلم اکثریت سے ٹکرانے کے ہم معنی ہے۔

۴۔ مارچ کے ذمہ داروں کو مذکورہ نازک صورت حال کا بخوبی علم ہے۔ تاہم ان کا جواب یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ امن و نظم کو بحال رکھنا اور عوامی جلوس کو حفاظت مہیا کرنا حکومت اور پولس کی ذمہ داری ہے، اور اس کو اسے انجام دینا چاہیے۔

اجودھیا مارچ کے موقع پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جس تصادم کا یقینی اندیشہ ہے، اس قسم کے فرقہ وارانہ تصادم ۱۹۴۷ سے اب تک بار بار مختلف شکلوں میں پیش آتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ

ان کی تعداد اب دس ہزار سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ مگر خود انھیں مسلم لیڈروں کے چھپے ہوئے بیانات کے مطابق، ہر ایسے تصادم میں پولس اور انتظامیہ نے ہمیشہ جانبدارانہ معاملہ کیا ہے۔ یعنی وہ غیر مسلم فرقہ کو حفاظت دے کر مسلم فرقہ کے لوگوں کو یک طرفہ طور پر اپنے ظلم کا نشانہ بناتی ہے۔ (مثال کے طور پر میرٹھ اور ملیانہ کا واقعہ، اپریل۔مئی ۱۹۸۷) ایسی حالت میں مسلم لیڈروں کا مذکورہ جواب اِس حدیثِ رسول سے ٹکرا رہا ہے کہ مومن ایک بِل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا (المومنُ لا یُلدغ مِن جُحرٍ مرّتین) جب ایک خطرناک بِل کا دوبار تجربہ کرنا بھی ایمان کے خلاف ہو تو ایسی ایک معلوم بِل کا دس ہزار بار تجربہ کرنا کیوں کر شریعت کے مطابق ہو سکتا ہے۔

۵۔ اجودھیا مارچ کے موقع پر پولیس اور انتظامیہ کا یہ متوقع کردار محض قیاس نہیں ہے۔ وہ "مرشد آباد مارچ" کی صورت میں انتہائی بھیانک طور پر پیشگی سامنے آچکا ہے۔ بنگال اور بہار کے مسلمان، مقامی مسلم لیڈروں کی رہنمائی میں، تقریباً ۵۰ ہزار کی تعداد میں ۲۴ جون ۱۹۸۸ کو مرشد آباد (مغربی بنگال) پہونچے تاکہ وہاں کی قدیم کٹرہ مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں۔ مگر خود مسلم لیڈروں کا بیان ہے کہ وہاں کی پولیس اور انتظامیہ نے جانتے بوجھتے ان نہتے مسلمانوں کو غیر مسلم فرقہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جنھوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے خونخوار عزائم کا نشانہ بنایا۔ مسلمان کٹرہ مسجد تک پہونچ کر نماز بھی ادا نہ کرسکے۔ ان میں سے کچھ لوگ راستہ ہی میں ہلاک ہوگیے، اور کچھ لوگ لٹ کر اور زخمی ہو کر اپنے گھروں کو ناکام واپس لوٹ آئے۔

جس پولس اور انتظامیہ کے نکمے پن کا یہ تجربہ ہو، اس کی حفاظت کے بھروسہ پر نہتے مسلمانوں کو تشدد پر آمادہ مجمع کے درمیان بھیجنا، شریعت تو درکنار، عقلِ عام (Common sense) کے بھی خلاف ہے۔

بعض ہوشیار لیڈر کہتے ہیں کہ ان مواقع پر اگر کچھ مسلمان مارے جائیں تو اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اس طرح ہمارا پروٹسٹ تو رجسٹر رہتا ہے۔ میں کہوں گا کہ اگر پروٹسٹ ہی رجسٹر کرنا مقصود ہے تو اس کے لیے عوام کو مروانا بے فائدہ ہے۔ پھر تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہمارے بے ریش اور باریش لیڈر نکلیں اور زبردستی خطرہ کے مقامات میں گھس کر لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں اگر لیڈروں میں سے کچھ لوگ مریں اور ان کی لاشیں سڑکوں پر نظر آئیں تو ہمارا پروٹسٹ زیادہ جلی خط

(Bold letters) میں رجسٹر ہوگا ، عوام کے مرنے کی صورت میں تو وہ صرف خفی خط میں رجسٹر ہو رہا ہے

۶ ۔ قرآن (الحج ۶۷) میں حکم دیا گیا ہے کہ فلا ینازعنّک فی الامر وادع الیٰ ربّک انّک لعلیٰ ھدًی مستقیم (بس وہ تم سے نزاع کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف بلاتے رہو۔ بے شک تم سیدھے راستہ پر ہو) یہ ایک اہم تعلیم ہے جو قرآن و حدیث میں مختلف انداز سے دی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں نزاع اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کرو ، بلکہ دعوت کا طریقہ اختیار کرو۔ موجودہ مسلم لیڈروں نے مسلم ملت کے مسائل کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے ، اس کو اگر سیاسی عمل (Political activism) کہا جائے تو اس سلسلہ میں اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ کو دعوتی عمل (Dawah activism) کہا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اسی طریق کار کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے ، آپ کے زمانہ میں سب سے زیادہ محترم مسجد کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ توحید کے اس گھر میں باقاعدہ مشرکانہ عمل کیا جاتا تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کے حل کے لیے " مارچ " کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ دعوت کے طریقے پر چل کر اس کو حل کیا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے اسی اسلامی حکمت کا لحاظ کرتے ہوئے فلسطین کے گرجا گھر کے اندر نماز نہیں پڑھی (ملاحظہ ہو الرسالہ مارچ ۱۹۸۶ ، صفحہ ۲)

بابری مسجد کی مورتی کا معاملہ بھی چھوٹے درجہ میں اسی نوعیت کا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر چل کر اس کا حل تلاش کرنا چاہیے ، اور کسی بھی وجہ سے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ بابری مسجد کے معاملہ میں سیاسی مارچ کا طریقہ اختیار کرنا ، یا یہ کہنا کہ اس کا تعلق شریعت سے نہیں ہے ، سرکشی کی حد تک اسلام کے خلاف ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ٹھیک اسی نوعیت کا معاملہ (شدید تر شکل میں) پیش آ چکا ہے تو مسلمانوں کے لیے کیوں کر جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں اسوۂ رسول کا لحاظ نہ کریں۔ وہ مکہ کی مسجد کے مماثل مسئلہ سے اجودھیا کی مسجد کے مسئلہ کے حل کے لیے نمونہ نہ پکڑیں۔

۷ ۔ حدیبیہ (۶ ھ) کے موقع پر بھی اسی سے ملتی جلتی صورت پیش آئی تھی۔ مسلمان عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اور حرم مکہ کے قابض لوگ اس میں مزاحم ہو رہے تھے۔ اسی طرح آج مسلمان

اجودھیا کی مسجد میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور اس کے قابض لوگ نہایت شدت کے ساتھ مزاحمت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

حدیبیہ کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ ان کو حکم ملا کہ عمرہ ادا کیے بغیر مدینہ واپس چلے جاؤ۔ اس حکم کی مصلحت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ مسلمان اگر اقدام پر اصرار کرتے تو جنگ کی نوبت آتی اور اس میں بہت سے مسلمان ناحق مارے جاتے (الفتح ۲۴-۲۵) گویا اگر مسلمانوں کی جان کا خطرہ ہو تو حرم مکہ جیسی مقدس مسجد کی طرف "مارچ" کرنا بھی غیر مطلوب ہو جاتا ہے۔ مسلمان کی جان کی حفاظت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے (ملاحظہ ہو الرسالہ اگست ۱۹۸۸، صفحہ ۱۴-۱۵)

اس مثال کی روشنی میں دیکھئے تو اجودھیا مارچ میں نہ صرف مسلمانوں کی ہلاکت کا اندیشہ ہے بلکہ اس میں پیش آنے والا جانی و مالی نقصان اس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو حدیبیہ کے وقت متوقع تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر پیش آنے والا نقصان تمام تر مقامی ہوتا۔ مگر آج جو حالات ہیں، ان کی روشنی میں یقینی ہے کہ اجودھیا مارچ کی صورت میں ہونے والا نقصان صرف اجودھیا تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ یقینی طور پر وہ پھیلے گا۔ اس کے نتیجہ میں پورے ملک کی فضا خراب ہوگی۔ جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد ہوں گے۔ اور حسب سابق مسلمان ہی ہر بار تباہی و بربادی کا نشانہ بنیں گے۔

اس عمومی بربادی میں مسلمانوں کے صرف ایک گروہ کا استثنار ہوگا۔ اور وہ ان بے ریش اور باریش رہناؤں کا ہے جو مسلمانوں کو آگے کر کے خود ان سے الگ ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی "جنرل" بن کر اپنے دفتر میں بیٹھ رہے گا، اور کوئی کسی بیرونی ملک کی کانفرنس میں شرکت کے لیے پرواز کر جائے گا۔ اس طرح سیاسی لیڈر اور ان کے حق میں اجازت نامہ جاری کرنے والے علما یقینی طور پر محفوظ رہیں گے۔ مگر عام مسلمان اتنے سخت مصائب سے دوچار ہوں گے جن کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

۸۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اجودھیا مارچ اگرچہ بظاہر اجودھیا کی طرف ہوگا، مگر اس کا اصل نشانہ نئی دہلی ہے۔ یہ نماز کی ادائیگی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اپنے دستوری حق کے استقرار کا مسئلہ ہے۔ بابری مسجد کی حیثیت محض علامت کی ہے۔ ورنہ اصل لڑائی اس بات کی ہے کہ دستور ہند میں جو مذہبی حقوق دیئے گیے ہیں، ان کو تسلیم کیا جائے اور حکومت اس بات کی ضامن بنے کہ دستور میں دیئے ہوئے کسی حق کو پامال نہیں کیا جائے گا۔

یہ مصلحت بھی ایک خودساختہ مصلحت ہے جو سنّتِ رسول سے واضح طور پر ٹکراتی ہے۔ یہاں میں دوبارہ حدیبیہ کی مثال دیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہونچ کر کعبہ کی زیارت کریں اور عمرہ کے مراسم ادا کریں۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو اہلِ مکہ (قریش) نے روکا اور کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ عمرہ کیے بغیر مدینہ واپس جائیں۔

قریش کا یہ فعل سراسر دستورِ عرب کے خلاف تھا۔ عرب میں یہ مسلّمہ دستور تھا کہ کوئی شخص کعبہ کی زیارت کے لیے آئے تو اس کو روکا نہ جائے۔ چنانچہ ساری قدیم تاریخ میں کبھی کسی کو زیارت کعبہ سے روکا نہیں گیا تھا۔ یہ دستوری حق اتنا زیادہ قطعی اور مسلّم تھا کہ جب سردارانِ قریش نے آپ کو روکا تو خود مشرکوں میں کچھ ایسے لوگ نکلے جنھوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ مثلاً حُلَیس بن علقمہ (سیدالاحابیش) جو قریش کا حلیف تھا، اس نے غصہ ہو کر کہا:

یا معشرَ قریش واللّٰہ ما علیٰ ھذا حالَفْناکم ولا علیٰ ھذا عاھدناکم۔ اَیُصَدُّ عن بیت اللّٰہ مَن جاءہ معظمًا لہ۔ والذی نفسُ الحُلیس بیدہ لتُخَلُّنَّ بین محمد وبین ماجاء لہ اولأنفِرنَّ بالاحابیش نفرۃَ رجلٍ واحدٍ۔

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۳۱۶)

اے قریش کے لوگو، خدا کی قسم، ہم اس بات پر تمہارے حلیف نہیں بنے تھے اور نہ اس بات پر ہم نے تم سے معاہدہ کیا تھا۔ کیا اُس شخص کو بیت اللہ سے روکا جانے لگا جو بیت اللہ کی زیارت کے لیے اور اس کی تعظیم کے لیے آیا ہو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں حُلیس کی جان ہے، تمہیں محمد اور وہ جس کام کے لیے آئے ہیں، اس کے درمیان سے ہٹنا ہوگا، ورنہ میں تمام حبشیوں کو لے کر یکلخت تم سے الگ ہو جاؤں گا۔

اس قسم کی بات کچھ اور مشرکوں نے بھی کہی۔ مگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اپنے "دستوری حق" کا سوال نہیں اٹھایا۔ اور نہ یہ کہہ کر اس کو اہم بنانے کی کوشش کی کہ یہ ایک علامتی واقعہ ہے، ہم کو "گربہ کشتن روزِ اول" کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ ورنہ آج عمرہ کے بارہ میں ہمارا دستوری حق ہمیں دینے سے انکار کیا جارہا ہے۔ کل ہم کو حج کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ اور پھر حقوق

میں دراندازی کی فہرست معلوم نہیں کہاں کہاں تک جا پہونچے گی ۔

موجودہ نام نہاد مسلم لیڈروں کی طرح ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر اکسائیں کہ دیکھو ، یہ صرف ایک عمرہ کا معاملہ نہیں ہے ۔ بلکہ ایک دستوری حق کا معاملہ ہے ۔ ہمیں بہرحال دستوری حق کی لڑائی لڑنی ہے ، اور اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹنا ہے جب تک ہم اپنے دستوری حق کو پوری طرح منوانے میں کامیاب نہ ہو جائیں ۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے " غیر دستوری " مطالبہ کو مان لیا اور عمرہ کیے بغیر حدیبیہ سے واپس چلے آئے ۔

قرنِ اول کی یہ مثال بتاتی ہے کہ " دستوری حق " اور " علامتی واقعہ " وغیرہ اہلِ باطل کی بولیاں ہیں ، وہ پیغمبر کی بولی نہیں ہے ۔ جو لوگ اس قسم کے الفاظ بول رہے ہیں وہ پیغمبر کے نمونہ پر نہیں چل رہے ہیں ، بلکہ باطل پرست قوموں کے نمونہ پر چل رہے ہیں ۔ پیغمبر کا طریقہ " دستوری لڑائی " لڑنا نہیں ہے ، بلکہ حقیقتِ واقعہ کو بدلنا ہے ۔ پیغمبر کا طریقہ دل کو جیتنا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کو جیتنا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کو اہلِ شرک کے حوالے کر دیا ، اور خود اپنی ساری کوشش انسانوں کو بدلنے پر لگا دی ۔ آخر کار جب انسان بدلے تو انسان بھی آپ کے قبضہ میں آگیے اور الفاظ بھی ۔

۹ ۔ جو لیڈر صاحبان اجودھیا مارچ کے حامی ہیں ، ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم اس وقت مارچ کی کارروائی نہ کریں اور اجودھیا کی مسجد کے معاملہ میں خاموش ہو جائیں تو غاصب گروہ کے حوصلے مزید بڑھ جائیں گے ۔ آج انھوں نے ایک مسجد پر قبضہ کیا ہے ، کل وہ دوسری مسجدوں پر قبضہ کریں گے ۔

یہ بالکل بے وزن بات ہے اور محض اپنی بدترین نالائقی پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہے ۔ راقم الحروف نے الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ (قیادت کا دیوالیہ پن) میں دکھایا ہے کہ اسی ملک میں دوسری بہت سی مسجدیں جو ۱۹۴۷ کے ہنگامے میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں ۔ آج وہ مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں ۔

مساجد کی بازیابی کے معاملہ میں یہ کامیابی تمام تر خاموش حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حاصل کی گئی ۔ اگر کوئی صاحب اس معاملہ میں براہِ راست واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں تو دہلی کی حد تک ، میں ذاتی ذمہ داری لیتا ہوں ۔ وہ میرے پاس آئیں اور میں ان کو لے جا کر دہلی کی کئی بڑی بڑی مسجدیں دکھاؤں گا ۔ کچھ سال پہلے تک یہ مسجدیں اغیار کے قبضہ میں تھیں ۔ آج وہ پوری طرح مسلمانوں کے پاس ہیں ۔ وہاں

باقاعدہ دینی مدرسے قائم ہیں۔ اور پنج وقتہ نمازیں جماعت کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ اس میں اتنا اور اضافہ کرلیجئے کہ یہ اعلیٰ کامیابیاں صرف اس لیے ممکن ہوئیں کہ اس جدوجہد میں پیشہ ور لیڈروں میں سے کسی لیڈر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

سیاسی اشو بنانے اور قومی پرسٹیج کی حیثیت دینے سے پہلے خود بابری مسجد کے معاملہ میں بھی اس خاموش اور حکیمانہ حل کا امکان پوری طرح موجود تھا۔ اس کی ایک مثال ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی وہ مشترکہ میٹنگ ہے جس کی روداد الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ صرف نام نہاد مسلم لیڈر ہیں جنھوں نے بابری مسجد کو قیادتی استحصال کا ذریعہ بنا کر اس قیمتی امکان کو برباد کیا۔ بابری مسجد کے معاملہ کو بگاڑنے کے اصل ذمہ دار مسلمان لیڈر ہیں۔ اگرچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کا رُخ دوسروں کی طرف موڑ دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدا میں ہندوؤں کی بیشتر تعداد اس معاملہ میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مسلمانوں کی حامی تھی۔ تھوڑے سے کٹّر ہندوؤں کے سوا کسی کو اس سے دل چسپی نہ تھی۔ اس کا ایک ثبوت ہندو اہلِ علم کے وہ منصفانہ مضامین ہیں جو ملک کے اخبارات و رسائل میں کثرت سے شائع ہو رہے تھے (ملاحظہ ہو الرسالہ، دسمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۱۷-۲۲)

نئی دہلی میں بابری مسجد ریلی (۳۰ مارچ ۱۹۸۶) کے بعد یہ فضا بدلنا شروع ہوئی۔ مسلم لیڈروں کی احمقانہ سیاست بازی معاملہ کو بگاڑتی چلی گئی۔ پہلے یہ مسئلہ سادہ طور پر معقولیت اور غیر معقولیت کے درمیان کا مسئلہ تھا۔ مگر بعد کو بڑھتے بڑھتے وہ ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کا مسئلہ بن گیا۔ اس نے دونوں گروہوں کے لیے فرقہ وارانہ عصبیت یا قومی ساکھ (Prestige) کی صورت اختیار کرلی۔ اس نوبت کو پہونچنے کے بعد مسلمان اس معاملہ میں اکیلے ہو گیے۔ انھوں نے ہندوؤں کی وہ حمایت کھو دی جو ابتدا میں انھیں وسیع پیمانہ پر حاصل تھی (ملاحظہ ہو الرسالہ جولائی ۱۹۸۵، صفحہ ۳۱-۳۲)

بابری مسجد کا مسئلہ اپنی ابتدائی صورت میں ایک محدود مقامی مسئلہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے سطحی لیڈروں نے اپنی ناقابل بیان نادانیوں کے ذریعہ انتہائی غلط طور پر اس کو ایک ملکی اور قومی مسئلہ بنا دیا۔ جب کوئی مسئلہ اس نوبت تک پہونچ جائے تو اس وقت معقولیت پس پشت چلی جاتی ہے۔ اور صرف گروہی عصبیت ہی قوموں کی رہنما کی حیثیت سے باقی رہتی ہے۔ ایسے وقت میں قوم کے کسی فرد کا

حق بات کہنا اپنے کو اپنی قوم کے اندر نکّو بنانے کی قیمت پر ہوتا ہے ، اور کون ہے جو نکّو بننے کی قیمت پر حق بات کا اعلان کرے ۔ ایسا حق پرست تو خود مسلمانوں میں بھی کوئی نہیں ، پھر ہندوؤں کے بارہ میں ہم کیسے امید کر سکتے ہیں کہ ان میں ایسے حق پرست جھنڈ کے جھنڈ موجود ہوں گے ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ صحافتی تاجروں اور سیاسی استحصال پسندوں کی شکارگاہ بنے ہوئے ہیں ۔ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھیں اس دلدل سے نکالا جائے ۔

۱۰۔ تاہم ان چیزوں سے قطع نظر ، بنیادی بات یہ ہے کہ مذکورہ قسم کے تمام اندیشے ایمانی تقاضے کے سراسر خلاف ہیں ۔ کیوں کہ کسی معاملہ میں جب خدا ورسول کا فیصلہ معلوم ہو جائے تو وہی خیر اور مصلحت کی بات ہے ۔ اس کے بعد عقلی نکتے نکالنا اور کسی دوسری چیز کو ملی مصلحت بتانا مجرمانہ سرکشی کے ہم معنی ہے ۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ : کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اس میں اختیار باقی رہے ۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا (الاحزاب ۳۶)

مسلمان اگر خدا و رسول پر ایمان رکھتے ہیں تو انھیں خدا و رسول کی رہنمائی کو بے چون و چرا مان لینا ہوگا ۔ ان کے لیے فلاح و سعادت کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ۔ خدا و رسول نے جس مصلحت کا لحاظ کیا ہو ، وہی صحیح اور معتبر مصلحت ہے ۔ دوسری کوئی مصلحت صحیح اور معتبر مصلحت نہیں ، خواہ بظاہر وہ ہم کو کتنی ہی زیادہ اہم دکھائی دیتی ہو ۔ اس سلسلہ میں محدث کبیر حضرت امام مالک کا یہ قول یاد دلانا کافی ہوگا : لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اوّلھا (اس امت کا آخر بھی صرف اسی سے درست ہوگا جس سے اس کا اول درست ہوا)

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں ، وہ دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت کرتی ہیں کہ اجودھیا مارچ یا بابری مسجد تحریک بلاشبہ ان مسائل میں سے ہے جن کا تعلق شریعت سے ہے ، اور مسلمانوں کو اس معاملہ میں لازمی طور پر شریعت کی رہنمائی میں عمل کرنا چاہیے ، اس سے آزاد ہو کر نہیں ۔ اگر انھوں نے اس معاملہ میں آزادانہ عمل کیا تو یقیناً وہ اس کے لیے خدا کے نزدیک مجرم قرار پائیں گے ۔ کسی بزرگ کو یہ حق نہیں کہ وہ اس معاملہ کو غیر شرعی معاملہ قرار دے ، اور نہ کسی بزرگ کا دیا ہوا سرٹیفکٹ اس معاملہ میں انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے والا ثابت ہو سکتا ہے ۔

۱۱۔ مسلم لیڈروں کی لفظی ہنگامہ آرائی سے بابری مسجد اشو میں تو کسی قسم کی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ البتہ ہندو فرقہ پرست عناصر کو ضرور نئی زندگی مل گئی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بدنام ہندو مورخ مسٹر پی این اوک نے دوبارہ نئے نئے انکشافات شروع کر دیئے ہیں۔ ان کا ایک انکشاف یہ اخبارات میں آیا ہے کہ دہلی کی جامع مسجد ایک مندر کی جگہ پر بنی ہے۔ قدیم زمانہ میں یہاں ایک ہندو مندر تھا۔ مغل دور میں اس کو ڈھاکر وہاں مسجد بنائی گئی (ٹائمس آف انڈیا ۵ اگست ۱۹۸۸) علی گڑھ میں ہندو تنظیموں کی میٹنگ میں اعلان کیا گیا کہ مسلمان اگر ۱۲ اگست کو اجودھیا مارچ کرتے ہیں تو اسی دن ہندوؤں کا جتھا مسجد میں ہنومان چالیسا کا پاٹھ کرنے کے لیے داخل ہوگا۔ اور یہ کہ " ۱۲ اگست وہ تاریخی دن ہوگا جب یہ بات صاف ہو جائے گی کہ بھارت میں مسلمانوں کو کن حالات میں رہنا ہے۔" (پرتاپ ۱۲ اگست ۱۹۸۸)

اس طرح کی باتوں کی بنا پر ممکن ہے کہ ہمارے لیڈر صاحبان کوئی خوبصورت عذر نکال کر مارچ کو ملتوی کر دیں جس کا اندیشہ الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں ظاہر کیا گیا تھا۔ تاہم اس غلط سیاست کے ذریعہ مسلمانوں کو تباہی کے جس کنارہ پر کھڑا کر دیا گیا ہے، اس کے نقصان کا سلسلہ مارچ کے التوا کے بعد بھی ختم نہ ہوگا۔

اس معاملہ میں مسلمان لیڈر جس طرح چیلنج کی زبان میں بات کرتے رہے ہیں، جس طرح انھوں نے مسلمانوں سے "بابری مسجد لے کے رہیں گے" کے نعرے لگوائے ہیں، اپنی پرجوش تقریروں سے جس طرح انھوں نے مسلمانوں کے جوش کو آخری حد تک ابھار دیا ہے، اس کے بعد مارچ کو روکنا کوئی سادہ واقعہ نہیں ہوگا۔ یہ مسلمانوں کو بہت بڑے پیمانہ پر اس احساس سے دوچار کرنے کے ہم معنی ہوگا کہ ہمارے لیے کچھ کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ کسی گروہ کو ایک ایسے نشانہ کے لیے ابھارنا جو پورا ہونے والا نہ ہو، نتیجہ کے اعتبار سے انھیں مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس میں مبتلا کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقدام وہی ہے جو سچا اقدام ہو، جھوٹا اقدام بربادی کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔ تکمیل مقصد کے بغیر مارچ کا فیصلہ واپس لینے کے بعد بھی واقعہ اپنی شدید ترین صورت میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے گا۔

یہی وہ المناک اندیشہ تھا جس کے بارہ میں الرسالہ ستمبر ۱۹۸۶ کے صفحہ اول پر ان الفاظ میں چیتاونی دی گئی تھی: بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے۔

ایک انتباہ

بیسویں صدی میں مسلمانوں نے بار بار ایسا کیا ہے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو اپنے ملی معاملات میں رہنما بنالیتے ہیں۔ یہ مزاج اب اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ مسجد اور نماز جیسے امور میں بھی سیاسی لیڈر ہی ان کے رہنما اور نمائندے بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ فعل ان کے تمام جرموں میں سب سے زیادہ سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے اس مزاج کو لازمی طور پر انھیں بدلنا ہوگا ورنہ شدید اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی نصرت سے محروم ہو جائیں، اور پھر اس دنیا میں کوئی ان کا حامی و مددگار نہ رہے۔

ایک تاجر کو اپنی دکان کے لیے سیلس مین کا انتخاب کرنا ہو تو وہ کبھی کسی دادا کو اپنی دکان کا سیلس مین نہیں بنائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کامیاب سیلس مین میں جو سب سے ضروری صفت درکار ہے وہ میٹھا بول ہے، جب کہ داداگیری کے پیشہ میں، اس کے برعکس، کڑوا بول سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دادا کڑوے بول کا ماہر ہوتا ہے، اس لیے وہ ایسے منصب کے لیے قطعاً موزوں نہیں جہاں میٹھا بول سب سے زیادہ مطلوب خصوصیت کی حیثیت رکھتا ہو۔

مسلمان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک داعی گروہ ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ ان کی تمام سرگرمیاں دعوت رخی (Dawah oriented) ہوں۔ وہ ہر دوسری مصلحت پر دعوت کی مصلحت کو غالب رکھیں۔ سیاسی لیڈر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا پورا فکر سیاست رُخی (Politics oriented) ہوتا ہے۔ وہ سیاسی مصلحت کو ہر دوسری مصلحت پر غالب رکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جیسے گروہ کی نمائندگی کے لیے سیاسی لیڈر کسی طرح بھی موزوں اور مناسب نہیں۔

داعی اور لیڈر دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف شخصیتیں ہیں۔ داعی ایجابی نفسیات کی پیداوار ہے اور لیڈر ردعمل کی نفسیات کی پیداوار۔ داعی محبت کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور لیڈر نفرت کی زمین پر۔ داعی دوسروں کو اپنے مطلوب کی نظر سے دیکھتا ہے اور لیڈر دوسروں کو اپنے حریف کی نظر سے۔ داعی کا مفاد دوسروں کے ساتھ مصالحت میں ہوتا ہے اور لیڈر کا مفاد دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ میں۔ داعی حقائق کو مرکز توجہ بناتا ہے اور لیڈر شوشوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ داعی خدا کی مرضی پر چلتا ہے اور لیڈر عوامی خواہشات پر۔ داعی کا مقصد لوگوں کا دل جیتنا ہے اور لیڈر کا مقصد لوگوں کا استحصال کرنا۔ داعی کی نظر اصل کام پر ہوتی ہے اور لیڈر کی نظر شہرت اور مقبولیت پر۔ خلاصہ یہ

ہے کہ داعی اصلاح کا نقیب ہوتا ہے اور لیڈر تخریب کا علم بردار ۔

داعی اور لیڈر کا یہ فرق لیڈر کو امت مسلمہ جیسے گروہ کی نمائندگی کے لیے اسی طرح غیر موزوں بنادیتا ہے جس طرح کسی دادا کی داداگیری اس کو دکان کی سیلس مین شپ کے لیے غیر موزوں بنا دیتی ہے۔ مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ اس ملک میں ان کے لیے مواقعِ کار کھلیں اور وہ خدا کی رحمت میں اپنا حصہ پائیں تو سب سے پہلا کام انھیں یہ کرنا ہے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو اپنے ملی اور دینی معاملات سے نکال پھینکیں۔ اس کے بغیر ان کے معاملات کبھی درست ہونے والے نہیں ۔

اگر مسلمانوں کو آج یہ حقیقت دکھائی نہیں دیتی تو وہ دن دور نہیں جب پردہ پھٹے اور تمام حقیقتیں اپنے برہنہ روپ میں سامنے آجائیں۔ اس وقت ہر آدمی سچائی کو ماننے پر مجبور ہوگا ، اگرچہ اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا ۔

اصل مسئلہ

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲ جولائی ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں : میرٹھ اور دہلی کے فسادات کا حال معلوم ہوا۔ اللہ پاک اپنی پناہ میں رکھے اور رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔ ایک واقعہ میرے دماغ کو جھٹکا دے رہا ہے کہ یہ اللہ کا عذاب تو ہم پر نازل نہیں ہو رہا ہے۔ بنگلہ والی مسجد میں تین دن حاضری کے لیے میں دہلی گیا تھا۔ شاہجہاں پور کٹھور میں میری بہن ہے۔ اس سے ملنے کے لیے گیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ کو ۱۱ بجے میرٹھ بھینسالی بس اسٹینڈ پہنچا۔ بھینسالی بس اسٹینڈ پر انکوائری کے لیے جارہا تھا کہ شاہجہاں پور کٹھور کے بارہ میں معلوم کروں۔ انکوائری پر دو غیر مسلم عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی نرمی اور خوش خلقی سے مسافروں کی انکوائری کا جواب دے رہی تھیں۔ مجھ سے آگے ایک مسلم نوجوان اور اس کے ساتھ ایک برقعہ پوش مسلم خاتون انکوائری کررہے تھے۔ یہ دونوں بھائی بہن تھے۔ وہاں حسب ذیل سوال وجواب ہوئے :

مسلم نوجوان: دلی کے واسطے ویڈیو کوچ ابھی نہیں آیا کیا۔

انکوائری خاتون: بھیا، ویڈیو کوچ ابھی نہیں آیا۔ اس کے بدلے لگزری بس لگی ہوئی ہے، اس سے نکل جاؤ۔

مسلم نوجوان: (زور سے بگڑ کر) ہم ویڈیو کوچ پوچھ رہے ہیں، وہ لگزری بس بتا رہی۔

انکوائری خاتون: ویڈیو کوچ دو گھنٹے بعد آئے گا۔ تب تک تم دلی پہنچ جاؤ گے۔

برقعہ پوش خاتون: تجھے کیا مطلب، ہم پہنچیں نہ پہنچیں۔ تو بتا ویڈیو کوچ کب آئے گا، تو اپنی ڈیوٹی کر۔

انکوائری خاتون: آپ لوگوں کے فائدے کو کہہ رہی ہوں۔ سمے بھی ادھک لگے گا، پیسہ بھی ڈھائی روپیہ ادھک۔

برقعہ پوش خاتون: بڑی آئی فائدہ بتانے والی۔ تجھے کیا مطلب، ہم ویڈیو سے جاویں یا نہ جاویں۔

مسلم نوجوان: چل آیا بیٹھ۔ دو گھنٹے بعد ویڈیو نہ آیا تو اس کی خبریں گے۔ (اس کے بعد وہ ناراض ہوتا ہوا چلا گیا)

اس کے بعد انکوائری کاونٹر کی غیر مسلم خاتون نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا : " مولانا صاحب، ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بہن بھائیوں پر ویڈیو کا بھوت سوار ہے " مسلمان اسلام کو اپنے عملی رُخ کے ذریعہ ذبح کر رہے ہیں تو مالک کائنات مدعو اقوام کے ذریعہ مسلمانوں کو ذبح کرا رہا ہے۔

عبدالسلام خاں، مائننگ انجینیر، سرکلر روڈ، چھندواڑہ ۴۸۰۰۰۱

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جو بتا رہی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا مزاج کیا ہے۔ وہ مزاج ہے ــــــ خلافِ مزاج بات کو برداشت نہ کرنا۔ مسلمانوں کا عدم برداشت کا مزاج اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ معمولی اختلافی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ اپنی خواہش کے خلاف کوئی ذرا سی بات ہو تو فوراً لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

ہر بار جب کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو وہ مسلمانوں کے اسی بگڑے ہوئے مزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ جھگڑالو قوم ہیں۔ ان کا یہ جھگڑا جب آپس میں ہو تو وہ انفرادی واقعہ بن کر رہ جاتا ہے، وہ عمومی فساد کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ مگر جب اس جھگڑے کا ایک فریق مسلمان اور دوسرا فریق ہندو ہو تو وہ فوراً عمومی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی یہ حالت صرف ہندستان میں نہیں ہے۔ ان کا یہی حال، بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر حال، پاکستان میں ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کہ پاکستان کے مسلمان معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑ نہ جاتے ہوں۔ بات کی وضاحت کے لیے یہاں میں صرف ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔

کراچی کا واقعہ ہے۔ ۱۹ جولائی ۱۹۸۷ کی رات کو کچھ مسلم نوجوان ایک منی بس میں سفر کر رہے تھے۔ سفر کے دوران ان کے اور کنڈکٹر کے درمیان تکرار ہو گئی۔ نوجوانوں نے کنڈکٹر پر حملہ کر دیا۔ بس رک گئی۔ اس کے بعد پولس آئی۔ پولس نے دخل دے کر معاملہ کو ختم کر دیا۔ مگر نوجوانوں کا غصہ ختم نہیں ہوا۔ اس وقت وہ چلے گیے اس کے بعد انھوں نے پولس کی " زیادتی " کی داستان سنا کر اپنی قوم کے مزید نوجوانوں کو بھڑکایا۔ اور ایک بھیڑ جمع کر کے ۲۱ جولائی کو کراچی کے اس تھانہ پر حملہ کر دیا۔ جہاں کی پولس نے دخل دے کر معاملہ کو ختم کیا تھا۔

اس " حملہ " میں ایک پولس افسر شدید طور پر زخمی ہوا۔ اور دو پولس کانسٹبل مارے گیے

اب پولیس مشتعل ہوگئی۔ اس نے لوگوں کے اوپر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے نتیجہ میں بیس آدمی سخت زخمی ہوگیے۔ ان زخمی ہونے والوں میں دو بچے بھی شامل تھے۔ کئی موتیں بھی واقع ہوئیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۳ جولائی ۱۹۸۷)

یہ بات میں نے ایک مسلمان لیڈر سے کہی تو وہ بگڑ گیے۔ انھوں نے تیز وتند لہجے میں کہا: یہ جھوٹ ہے۔ مسلمان کبھی فساد نہیں کرتا۔ آپ مسلم دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں اس لیے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں آپ کو اپنی یہ بکواس بند کرنی پڑے گی، ورنہ مسلمان آپ کو سبق پڑھانے پر مجبور ہوں گے۔

میں نے نرمی کے ساتھ جواب دیا: میرے بھائی، آپ نے خود ہی میرے دعوے کا ثبوت فراہم کر دیا۔ آپ نے اس وقت جو انداز اختیار فرمایا ہے، اسی کا نام اشتعال انگیز رد عمل ہے اور یہ اشتعال انگیز رد عمل ہی تمام فرقہ وارانہ فسادات کی اصل جڑ ہے۔ آپ اور آپ جیسے دوسرے مسلمان باہمی معاملات میں سنجیدہ انداز اختیار کرنا نہیں جانتے، اسی سے معمولی واقعہ فساد بن جاتا ہے۔ اگر آپ لوگ سنجیدہ اور مثبت انداز اختیار کرنا سیکھ لیں تو تمام فسادات کی جڑ کٹ جائے۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں یہ بات تقریباً ثابت شدہ ہے کہ اس کا آغاز ہمیشہ کسی مسلمان کی اشتعال انگیز کارروائی سے ہوتا ہے۔ یہ معاملہ ابتداءً ایک ہندو اور ایک مسلمان کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد خود مسلمانوں ہی کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ انفرادی واقعہ بہت جلد قومی واقعہ بن جاتا ہے۔ دو فرد کا فساد دو قوم کے فساد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اب ہندو چونکہ اس ملک میں طاقت ور پوزیشن میں ہے، اس کا رد عمل مسلمان کے حق میں بہت ہولناک ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ایک کے بدلے میں ایک سو کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

فساد کے نتائج کو اگر صرف کمیت اور اعداد وشمار کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہندو ظالم نظر آئیں گے اور مسلمان مظلوم۔ مگر میں اس تقسیم کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ قرآن کی رو سے اصل مجرم وہ ہے جو آغاز کرے (وھم بدؤکم اول مرۃ) اسی لیے کہا گیا ہے کہ شروع کرنے والا زیادہ بڑا ظالم ہے (البادئ اظلم، تفسیر النسفی، الجزء الثانی، صفحہ ۱۱۸) شروع کرنے والا شخص روایت کو توڑتا ہے،

وہ فریق ثانی کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑکاتا ہے۔ ایسی حالت میں بالکل فطری بات ہے کہ شروع کرنے والے کو زیادہ بڑا ظالم قرار دیا جائے۔

دوسرا پہلو معاملہ کا عملی پہلو ہے۔ یعنی یہ کہ یہ فسادات ختم کس طرح ہوں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس طرح کے پے چیدہ نزاعات ہمیشہ یک طرفہ اقدام سے ختم ہوتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ ۵۰ فی صد ذمہ داری ہندو لیں اور ۵۰ فی صد ذمہ داری مسلمان قبول کریں اور اس طرح دونوں کے مشترکہ فیصلہ سے فسادات کا خاتمہ کیا جائے تو ایسا مشترکہ فیصلہ کبھی ہونے والا نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں مشرکین مکہ اور مسلمانانِ مدینہ کا جھگڑا صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کی شکل میں یک طرفہ طور پر معاملہ کو ختم کرنے پر راضی ہوگیے دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور جاپان کا جھگڑا صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ جاپان نے یک طرفہ طور پر امریکہ کی تمام شرائط کو مان لیا۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات بھی اسی طرح یک طرفہ تدبیر کے ذریعے ختم ہوں گے یا پھر وہ اسی طرح لامتناہی طور پر جاری رہیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس یک طرفہ اقدام کے لیے کون آگے بڑھے۔ جواب بالکل واضح ہے۔ یک طرفہ اقدام پر ہمیشہ وہ فریق راضی ہوتا ہے جو تصادم کی صورت میں زیادہ نقصان اٹھا رہا ہو۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں زیادہ بڑا نقصان مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں ہی کو اس معاملہ میں پہل کرنا چاہیے۔

اس نقصان سے میری مراد مادی نقصان نہیں ہے، بلکہ آخرت کا نقصان ہے۔ اس معاملہ میں یقینی طور پر ہندو بھی نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ نقصان براہ راست کم اور بالواسطہ زیادہ ہے۔ تاہم ہندو کا جو نقصان ہے وہ مادی اور اقتصادی اعتبار سے ہے۔ جب کہ مسلمان کا نقصان یہ ہے کہ وہ دعوت کے امکان کو کھو دیتا ہے۔ ہر بار جب فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو ہندو مسلم تناؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس مسلسل تناؤ نے اس فضا کو برباد کر کے رکھ دیا ہے کہ ہندو کے سامنے مسلمان اپنی وہ دعوتی ذمہ داری ادا کریں جو آخری پیغمبر کا امتی ہونے کی حیثیت سے لازمی طور پر ان کے اوپر عاید ہوتی ہے۔ اور جس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر خود مسلمانوں کی اپنی نجات بھی سخت مشتبہ ہے۔

دکان دار اور گاہک میں جھگڑا ہو اور دونوں کے درمیان دوری پیدا ہو جائے تو زیادہ بڑا لوزر (کھونے والا) کون ہوگا۔ واضح ہے کہ ایسی صورت میں زیادہ بڑا لوزر دکان دار ہوگا۔ اس لیے دکاندار ہی کو یہ ذمہ داری لینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے اور گاہک کے درمیان دوری کے اسباب پیدا نہ ہونے دے۔ اگر بالفرض دوری کا کوئی سبب پیدا ہو جائے تو وہ یک طرفہ طور پر اس کو ختم کرے۔

یہ ایک دنیوی مثال ہے۔ یہی مثال آخرت کے معاملہ کی بھی ہے۔ مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان جھگڑا اور تناؤ پیدا ہو تو زیادہ بڑا لوزر یقینی طور پر مسلمان ہوگا۔ کیوں کہ اس دوری کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے مدعو کو کھو رہا ہے۔ جب کہ مسلمان کے عقیدے کے مطابق، مدعو اس کے لیے تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ دعوت کا عمل اس کو انصار اللہ کا درجہ عطا کرتا ہے۔ دعوت کا عمل اس کو پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل کرتا ہے۔ اس لیے مسلمان ہی کو یہ ذمہ داری لینی ہے کہ وہ اپنے اور مدعو کے درمیان تناؤ پیدا نہ ہونے دے اور اگر کسی وقت تناؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو یک طرفہ طور پر اس کو ختم کر دے۔

اصل مسئلہ

اس دنیا کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اس نے تمام انسانوں کو ایک خاص منصوبہ کے تحت پیدا کیا ہے۔ وہ منصوبہ یہ ہے کہ انسان کو موجودہ دنیا کے حالات میں رکھ کر آزمائے۔ اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جنت یا جہنّم میں داخل کرے (الملک ۲)

یہی وہ حقیقت ہے جس سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے تمام پیغمبر آئے (رسلاً مبشرین ومنذرین لئلّا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل) مگر پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات کو ان کی امتیں ضائع کرتی رہیں۔ آخر میں اسی انذار و تبشیر کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔ آپ جو تعلیم لائے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اصلی حالت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

قرآن میں یہی ابدی دین اپنی محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اب انسان کی نجات کا انحصار اسی محفوظ دین کو اختیار کرنے پر ہے جس کا نام اسلام ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ (آل عمران ۸۵)

ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ مسلمانوں کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اس حقیقت سے باخبر کریں تاکہ بھٹکی ہوئی قوموں پر نجاتِ آخرت کا دروازہ کھلے۔ اور جو لوگ معلوم ہو جانے کے باوجود خدا کی ہدایت کو اختیار نہ کریں ان پر یہ گواہی قائم ہو جائے کہ انھیں حقیقتِ واقعہ سے باخبر کر دیا گیا تھا (لیکون الرسول شہیدا علیکم وتکونوا شہداء علی الناس، الحج ۷۸) یہ ذمہ داری اتنی اہم ہے کہ اس کو ادا نہ کرنے کی صورت میں خود یہ معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے یہاں پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی قرار پائیں گے یا نہیں۔

اس حقیقت کی روشنی میں غور کیجیے تو مسلمانوں کے ساتھ اس ملک میں جو کچھ پیش آرہا ہے وہ اسی خدائی ڈیوٹی سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے دوسری قوموں کو خدائی پیغام سے آگاہ کرنے کا کام انجام نہیں دیا۔ اس لیے اب خدائی قانون کے مطابق ان کی تنبیہ کی جارہی ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں آگاہ ہو جائیں۔

جب بھی اس ملک میں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے اور مسلمان غیر مسلموں کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں تو ہمیشہ اس سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ "قال" کی زبان میں نہیں، بلکہ "حال" کی زبان میں۔ وہ آواز یہ ہوتی ہے:

تم نے ہماری آخرت کو برباد کیا، ہم تمہاری دنیا کو برباد کریں گے

مسلمانوں کے پاس خدا کے محفوظ دین کی امانت ہے۔ مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ اس ملک کے تمام انسانوں کو اس نازک حقیقت سے باخبر کریں۔ وہ اس کو لوگوں کی قابلِ فہم زبان میں لوگوں تک پہنچائیں۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ صدیاں گزر گئیں مگر مسلمانوں کے درمیان اس مقصد کے لیے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اس حقیقت ربانی سے لوگوں کو آشنا کریں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے یہ کیا کہ انھوں نے لوگوں سے نفرت کی۔ انھوں نے لوگوں کو حقیر سمجھا۔ وہ لوگوں کی ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر ان سے لڑائی جھگڑتے رہے۔ انھوں نے اپنے اور ان کے درمیان مصنوعی تشخصات کی دیواریں کھڑی کیں۔ اس کے نتیجہ میں لوگ مسلمانوں سے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے دین سے بیزار ہو گیے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان وہ معتدل

فضا باقی نہ رہی جس میں دوسرے لوگ مسلمانوں کے دین پر غور کریں اور اس کے بارے میں ٹھنڈے ذہن کے ساتھ فیصلہ کر سکیں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ تھا۔ داعی ایک کامیاب دکاندار کی طرح، یک طرفہ اخلاقیات پر کھڑا ہوتا ہے۔ داعی اپنے آپ کو اس کا پابند بناتا ہے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی تلخیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرے گا۔ مدعو اگر کوئی برا سلوک کرے تب بھی وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، تاکہ دونوں کے درمیان کہنے اور سننے کا ماحول برباد نہ ہونے پائے۔ مگر مسلمان اس داعیانہ اخلاق پر قائم نہ رہ سکے۔

مسلمانوں نے لوگوں سے ان کی آخرت چھینی تھی، اب لوگ ان سے ان کی دنیا چھین رہے ہیں۔ لوگ اپنے ظلم سے صرف اس وقت باز آئیں گے جب کہ ہم اپنے ظلم سے باز آئیں۔ اس سے پہلے یہ سلسلہ بند ہونے والا نہیں۔

خدا کی تنبیہ

مسلمانوں کے ساتھ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندو کا ظلم نہیں بلکہ وہ خدا کی تنبیہ ہے۔ جو آدمی اس میں شک کرے اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ قرآن و حدیث سے بالکل ناواقف ہے۔

مسلمانوں کے مسئلہ کی جڑ یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے بندوں کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو خدا کے حکم کے سراسر خلاف تھا۔ مسلمان اپنے دورِ اقتدار میں ہندوؤں کو حقیر سمجھتے رہے۔ اور اب جب کہ ان کے پاس اقتدار نہیں ہے تو وہ ہندوؤں کو اپنا دشمن سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں ہی باتیں یکساں طور پر جرم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہندو قوم مسلمانوں کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمان داعی ہیں اور ہندو مدعو ہیں۔ ہندو کی نسبت سے مسلمان کے اوپر سب سے پہلا اور سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اس کو خدا کے دین کا پیغام پہنچائیں۔ اپنے اور ہندو قوم کے درمیان ناصحانہ فضا قائم کرنے کے لیے مسلمانوں پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ہندو کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کریں۔ جس طرح مسلمانوں پر دعوت فرض ہے، اسی طرح دعوت کی خاطر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرنا بھی

ان کے اوپر فرض ہے۔

مسلمان اس ملک میں سیکڑوں سال سے ہندوؤں کے ساتھ رہ رہے ہیں مگر ان کے درمیان کوئی ایک بھی قابلِ ذکر تحریک یا قابل ذکر شخصیت نہیں ابھری جو مسلمانوں کو ان کے داعیانہ فرض کی طرف توجہ دلائے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا سب سے بڑا خلا ہے جس پر انھیں سب سے زیادہ غور کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا یہ حال ہے کہ اس کو اس کام کی اہمیت کا شعور ہی نہیں۔ بعض افراد اگر اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں تو وہ بھی یہ کہہ کر عملاً اسے قابلِ ترک قرار دیدیتے ہیں کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرلو، اس کے بعد غیر مسلموں کی اصلاح کرنا۔ یہ دونوں ہی باتیں یکساں طور پر خدا کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں۔ پہلی روش اگر خدا اور رسول کے حکم سے سرتابی ہے تو دوسری روش کا مطلب خود اپنے آپ کو خدا اور رسول کی جگہ بٹھانا ہے۔ کیوں کہ سارے قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرو، اور جب مسلمانوں کی اصلاح کا کام مکمل ہو جائے اس کے بعد غیر مسلموں کو خدا کے دین کی دعوت دو۔ اور جب قرآن و حدیث میں ایسا کوئی حکم بیان نہیں ہوا تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ احکام دین کی فہرست میں خود ساختہ طور پر اس قسم کے ایک حکم کا اضافہ کرے۔

مسلمانوں کا موجودہ مسئلہ اسی فرض سے ان کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ مسائل کا یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک غفلت کی یہ صورت حال باقی رہے۔ ان مسائل کا حل یہ نہیں ہے کہ مسلمان دوسروں کو اس کا ذمہ دار قرار دے کر ان سے لڑنا شروع کر دیں۔ ان کا واحد حل یہ ہے کہ وہ اپنی کوتاہی کا اقرار کرکے اس فریضۂ دعوت کو ادا کرنا شروع کر دیں جس کو انھوں نے صدیوں سے چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے سوا ہر دوسری تدبیر ان کی سرکشی میں اضافہ کے ہم معنی ہے نہ کہ مسئلہ کے حل کی طرف پیش قدمی۔

مسلمان اگر بالفرض یہ محسوس کریں کہ وہ برادران قوم کو دعوت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تب بھی وہ یقینی طور پر ایک کام کرنے کی پوزیشن میں ہیں، اور وہ دعا ہے۔ "دعوت نہ دے سکو تو دعا کرو" یہ ایک لفظ میں مسلمانوں کے پروگرام کا خلاصہ ہے۔ مسلمانوں کو پورے اخلاص

کے ساتھ برادرانِ وطن کی ہدایت کا حریص بننا چاہیے۔ دعوت کے مواقع نہ ہوں تو ان کے حق میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ دعا کرنا چاہیے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ براہ راست دعوت کے مواقع ہمارے لیے کھول دے۔

مگر مسلمانوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ برادران وطن کو خدا کے دینِ رحمت کا مخاطب بنانا تو درکنار، مسلمان پچاس برس سے ان کے خلاف بددعائیں کرنے میں مشغول ہیں۔ ان کے تمام اصاغر و اکابر اللّٰھم اھلك الکفرة والمشرکین کی پکار بلند کیے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ان کی اس قسم کی بددعا کبھی خدا کے یہاں قبول ہونے والی نہیں، خواہ مسلمان ایک ہزار سال تک اس کے الفاظ دہراتے رہیں، اور خواہ ان کے تمام اکابر و اعاظم جمع ہو کر اس پر آمین کہہ رہے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تمام بد دعائیں خدا کی منشا کے بالکل خلاف ہیں۔ دوسری قوموں کے لیے ہمارے اندر یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کو خدا کے دین رحمت کے سایہ میں لائیں نہ کہ دینِ رحمت میں لانے کی واقعی کوشش کیے بغیر انھیں عذاب کے گڑھے میں دھکیلنے لگیں۔ آج خدا اس انتظار میں ہے کہ ہم اس کے سامنے لوگوں کی ہدایت کی دعا پیش کریں تاکہ وہ اس کو قبول کر کے اقوام عالم کے لیے ہدایت کا راستہ کھولے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خدا کے سامنے لوگوں کی ہلاکت کی دعا پیش کر رہے ہیں۔ ایسی دعا خود دعا کرنے والے کے منھ پر مار دی جائے گی، وہ کبھی قبولیت کا شرف حاصل کرنے والی نہیں۔

روشنی دینا دنیا کو سب سے بڑی چیز دینا ہے۔ مگر روشنی دینا سب سے بڑی قربانی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ دنیا کو "روشن" کرنے کے لیے اپنے آپ کو "بے روشن" کر لینا پڑتا ہے۔ اسی بات کو ایک مغربی مفکر نے ان لفظوں میں کہا ہے کہ موم بتی دوسروں کے لیے اُجالا کرتی ہے مگر وہ خود اپنے آپ کو فنا کر لیتی ہے:

A candle lights others and consumes itself.

داعی کی مثال بھی یہی ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ کو قرآن میں سراج منیر کہا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ داعی کا مقام بہت بلند ہے۔ داعی کے لیے دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمتیں مقدر

ہیں۔ مگر اس خصوصی انعام کا حق دار بننے کے لیے آدمی کو خصوصی قربانی بھی دینا ہے۔ اور وہ خصوصی قربانی یہ ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر تمام ناخوش گواریوں کو برداشت کرے۔ وہ ہر حال میں مدعو کا خیر خواہ بنے، خواہ مدعو اس کے ساتھ ظلم اور عداوت کا معاملہ کیوں نہ کر رہا ہو۔

مدعو کے خلاف نفرت اور انتقام اور مقابلہ آرائی کا طریقہ اختیار کرنا منصوبۂ خداوندی کے سراسر خلاف ہے۔ اور جو لوگ خدا کے منصوبہ کے خلاف عمل کریں وہ خدا کی دنیا میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔

موجودہ مسائل کو حل کرنا ہے تو اس کے سبب کو دور کیجیے۔ اور وہ سبب یہ ہے کہ اپنی داعیانہ کوتاہی کو ختم کیجیے۔ اپنے اور برادرانِ وطن کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال کیجیے۔ اس فریضہ کو ادا کرنے کے بعد ہی مسلمان عزّت کا مقام پا سکتے ہیں۔ بندوں کی نظر میں بھی اور خدا کی نظر میں بھی۔ اس کے سوا نجات اور کامیابی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

حکیمانہ طریقہ

معین الدین صاحب (پیدائش ۱۹۵۶) بگہا (ضلع چمپارن) کے رہنے والے ہیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۸ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے یہاں کا ایک واقعہ بتایا جو بے حد سبق آموز ہے۔

بگہا کی جامع مسجد کا نام جامعہ انوار ہے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ کی رات کو کسی شخص نے خنزیر کاٹ کر اس کا سر مسجد کے اندر سائبان والے حصہ میں ڈال دیا۔ صبح کے وقت جب لوگ نماز فجر کے لئے آئے تو نماز کی ادائگی کے بعد ایک شخص (ارمانی خاں) نے اس کو دیکھا۔ اس وقت بگہا کے امیر تبلیغ حاجی اسرار الحق صاحب حسب معمول نمازیوں کو بیٹھا کر تعلیم کر رہے تھے۔ ارمانی خاں نے واقعہ کی خبر دی تو وہ فوراً اٹھ کر مقام واردات پر آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ واقعۃً خنزیر کا کٹا ہوا سر مسجد کے اندر پڑا ہے۔

حاجی اسرار الحق صاحب جو الرسالہ کے مستقل قاری ہیں، انھوں نے شور وغل کرنے کے بجائے یہ کیا کہ فوراً اس کو کپڑے میں لپیٹ کر اٹھالیا۔ پھر موذن کے ہمراہ وہ تیزی سے اس کو لے کر باہر نکلے اور لے جاکر بیت الخلا، کے کنوئیں (بورنگ) کے اندر ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ مسجد میں آئے اور پانی سے اچھی طرح دھو کر مسجد کو صاف کر دیا۔ اس کے بعد حاجی صاحب ڈاکٹر ایم یوخان سے ملے۔ انھوں نے حاجی صاحب کی کارروائی سے اتفاق کیا۔ دونوں مقامی تھانہ میں گئے۔ وہاں انھوں نے پولیس کو پورے واقعہ کی خبر دے دی۔ تھانہ والوں نے حاجی صاحب کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ہمارے اوپر پہاڑ اتنا بڑا بوجھ تھا، آپ نے اس کو ہمارے سر سے ٹال دیا۔

بگہا کے مہتر خنزیر پالتے ہیں اور اس کا کاروبار کرتے ہیں۔ پولیس والے مہتروں کی بستی میں گئے اور ان کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ تاہم اصل مہتر جس نے کسی کے کہنے پر یہ کارروائی کی تھی، وہ رات ہی کو بھاگ کر نیپال چلا گیا۔

معین الدین صاحب نے بتایا کہ خبر سن کر بڑی تعداد میں مسلمان مسجد میں جمع ہو گئے اور انھوں نے حاجی صاحب کو برا بھلا کہا۔ مگر ساری بستی کے ہندوؤں نے ان کی تعریف کی۔ مثلاً ایک ہندو دکاندار نے کہا کہ حاجی صاحب نے وہ کام کیا ہے جو مہان آدمی کیا کرتا ہے۔ انھوں نے

سیکڑوں آدمیوں کو ہتیا ہونے سے بچالیا۔ ایک اور ہندو نے کہا کہ جس شخص نے مسجد میں خنزیر ڈالا وہ بہت گرا ہوا انسان ہے۔ جو شخص عبادت خانہ کو گندا کرے اس سے زیادہ برا آدمی اور کوئی نہیں۔ وغیرہ۔

حاجی صاحب نے اعراض اور حکمت کے طریقہ کو اختیار کرکے پوری بستی کو تباہی و بربادی سے بچالیا۔ اگر وہ خنزیر کو دیکھ کر مشتعل ہو جاتے تو یقینی طور پر فساد کی نذر ہو جاتا۔

معین الدین صاحب سے میں نے پوچھا کہ اس معاملہ میں عام مسلمانوں کا ردعمل کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ خبر پھیلی تو مسلمان ادھر ادھر سے آکر مسجد میں جمع ہونے لگے۔ گیارہ بجے تک ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وہاں آچکے تھے۔ وہ لوگ سخت غصہ میں تھے اور حاجی اسرار الحق صاحب کے اوپر بری طرح برس رہے تھے۔ کچھ لوگ برا بھلا کہہ رہے تھے۔ کچھ باقاعدہ گالی دے رہے تھے۔ ساری باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ تم بزدل ہو، تم پست ہمت ہو۔ تم نے کیوں خنزیر کو غائب کیا۔ اگر وہ ہمارے پاس موجود ہوتا تو آج ہم انھیں بتادیتے .....

میں نے کہا کہ یہ بزدلی اور بہادری کا وہ معیار ہے جو مسلمانوں کی قومی شریعت میں پایا جاتا ہے۔ خدا کی شریعت کا معیار اس سے مختلف ہے۔ خدا کی شریعت کا معیار حدیث میں اس طرح بتایا گیا ہے:

عن ابی هريرة، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ليس الشديد بالصرعة۔ انما الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاقتور وہ نہیں ہے جو کشتی میں کسی کو پچھاڑ دے۔ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔

مذکورہ حدیث بہادری کا یہ معیار بتاتی ہے کہ آدمی غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہو۔ اشتعال انگیزی کے باوجود وہ اشتعال میں نہ آئے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے نزدیک بہادری یہ ہے کہ کوئی شخص اگر غصہ دلانے والا فعل کرے تو وہ بھڑک کر اس سے لڑنا شروع کر دیں۔ مسلمان ایسے واقعات کو قومی وقار کا مسئلہ بنالیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ فوراً فریق مخالف سے لڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ اس کو شرعی نگاہ سے دیکھیں تو وہ وہی کریں جو مذکورہ حاجی صاحب نے ایسے موقع پر کیا۔

بیعت الرضوان

بیعت الرضوان (٦ ھ) اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے جو حدیبیہ کے ضمن میں پیش آیا۔ یہ سفر اصلاً عمرہ کرنے کے لیے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس وقت قریش سے آپ کی صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران آپ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تاکہ وہ اہل مکہ کو بتائیں کہ آپ مکہ میں صرف عبادت کے لیے داخل ہونا چاہتے ہیں نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کے لیے۔

قریش اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کو اپنے یہاں روک لیا۔ جب آپ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مشہور ہوگیا کہ قریش نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر بے حد غیر معمولی تھی۔ چنانچہ اس کو سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چودہ سو اصحاب کو جمع کیا اور ان سے بیعت لی۔ اسی بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔

یہ بیعت کس بات پر تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر بیعت لی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ، جو خود اس بیعت میں شریک تھے، انھوں نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی۔ بلکہ اس بات پر بیعت لی کہ ہم بھاگیں گے نہیں (ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لم یبایعنا علی الموت ولکن بایعنا علی اَن لا نَفِرّ) چنانچہ ابن قیم نے اس کے تذکرہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

فبایعوہ علیٰ ان لا یفروا)

حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ ٹکراؤ کے ہر موقع سے یک طرفہ طور پر اعراض کرتے رہے۔ اپنی جماعت کے سب سے زیادہ نرم مزاج آدمی کو اس سفارت کے ساتھ بھیجا کہ ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر جب قتل کی خبر ملی اس وقت بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ خبر ملتے ہی قریش کے اوپر ٹوٹ پڑیں۔ بلکہ اپنے مقام پر ٹھہر کر لوگوں سے صرف اس بات کی بیعت لی

کہ ہم یہیں جمے رہیں گے۔ قریش اگر خود سے لڑنے کے لیے آتے ہیں تو مقابلہ کریں گے۔ اور اگر وہ صلح پر راضی ہوتے ہیں تو صلح کر لیں گے، خواہ یہ صلح یک طرفہ شرطوں پر کیوں نہ ہو، جیسا کہ آپ نے عملاً کیا۔ بیعت الرضوان کے باوجود صلح کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت اصلاً جنگ کے لیے نہ تھی۔ اگر وہ جنگ کے لیے ہوتی تو ناممکن تھا کہ اس کے بعد آپ اپنے دشمن سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کر لیں۔

حضرت عثمان بن عفان جب مکہ گیے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے وہاں گیے تھے۔ بین اقوامی رواج کے مطابق، سفیر کا قتل اعلانِ جنگ کے ہم معنی ہوتا ہے۔ جب یہ خبر ملی کہ قریش نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا ہے تو قدرتی طور پر آپ نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ قریش اب آخری طور پر آمادۂ جنگ ہو چکے ہیں، وہ کسی حال میں صلح اور امن کا معاملہ کرنے پر راضی نہیں ہیں۔ اس خبر نے وقتی طور پر صورت حال کو یکسر بدل دیا۔

ابتدائی صورت حال کے مطابق، آپ کے سامنے صلح یا جنگ میں انتخاب (Choice) کا مسئلہ تھا۔ اس وقت آپ نے جنگ کو چھوڑ کر صلح کا انتخاب فرمایا تھا۔ مگر قتلِ سفیر کی خبر نے ظاہر کیا کہ اب فرار یا جنگ میں سے کسی ایک صورت کے انتخاب (Choice) کا مسئلہ درپیش ہے۔ یعنی قریش کسی حال میں بھی صلح پر راضی نہیں ہیں۔ وہ ہر حال میں جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت آپ نے اپنے اصحاب سے عدم فرار، اور بصورتِ جارحیت دفاع کی بیعت لی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی تو پھر دوبارہ آپ جنگ کو چھوڑ کر صلح پر راضی ہو گیے، حالاں کہ یہ صلح آپ کو دشمن کی یک طرفہ شرطوں پر کرنی پڑی۔

بیعت الرضوان کا پیغام یہ ہے کہ تمہارے لیے اگر انتخاب (Choice) فرار اور جنگ کے درمیان ہو تو فرار کو چھوڑ کر جنگ کا طریقہ اختیار کرو۔ اور اگر تمہارے لیے انتخاب (Choice) صلح اور جنگ کے درمیان ہو تو جنگ کو چھوڑ کر صلح کا طریقہ اختیار کرو، خواہ یہ صلح فریق ثانی کی یک طرفہ شرائط پر ہی کیوں نہ ہو۔ مزید یہ کہ فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کو اختیار کرنے کا حکم بھی مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ کیوں کہ حدیبیہ (۶ ھ) میں آپ نے فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کا فیصلہ فرمایا۔ مگر اس سے پہلے مکہ (۱ ھ) میں اسی طرح کی صورت حال میں آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی۔

غور طلب

یونانی مائتھالوجی میں ایک لعنت زدہ بادشاہ ہے جس کا نام سیسی فس (Sisyphus) ہے۔ اس کو دیوتاؤں نے یہ سزادی کہ وہ ایک بھاری پتھر کو لے کر پہاڑ پر چڑھے اور اس کو آخری چوٹی پر پہونچائے۔ وہ پتھر کو لے کر پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ مگر اس پر ایک مزید لعنت ہے۔ چنانچہ جب وہ چوٹی کے قریب پہونچتا ہے تو پتھر اس سے چھوٹ کر نیچے کی طرف لڑھک پڑتا ہے۔ بادشاہ دوبارہ نیچے اترتا ہے اور دوبارہ پتھر کو لے کر اوپر چڑھنا شروع کرتا ہے۔ مگر دوبارہ ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہونچتا ہے تو پتھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر جاتا ہے۔ یہی صورت بار بار پیش آتی ہے اور بادشاہ کبھی پتھر کو لے کر چوٹی تک نہیں پہونچ پاتا۔ اس بنا پر اس کی لعنت بھی اس سے رفع نہیں ہوتی :

In Greek mythology, there is a tragic legend of Sisyphus who was awarded the punishment of rolling a huge stone up a hill to the top. But there was an additional curse on him that just before reaching the top, the stone would constantly roll down and his everlasting labour would begin again and again.

"بالاکوٹ کے معرکہ" کے بارہ میں ایک مسلمان مصنف لکھتے ہیں کہ "اس معرکہ میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالم انسانیت کے لیے رونق تھے۔ انسانیت اور اسلام کے باغ کا ایسا عطر مجموعہ صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا، اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ کو وہ بالاکوٹ کی مٹی میں مل گیا۔ مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔"

موجودہ زمانہ میں جو بڑی بڑی مسلم تحریکیں اٹھیں، ان کے احوال پڑھیے تو تقریباً بلا استثناء ہر ایک کے یہاں یہی لکھا ہوا ملے گا کہ ہم تو کامیابی کی چوٹی کے بالکل قریب پہونچ گئے تھے۔ مگر عین وقت پر فلاں شخص کی سازش نے سارا معاملہ بگاڑ دیا اور کفر و الحاد کا قلعہ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ان تحریکوں کا یہ بیان ایک قاری کو اس شبہہ میں ڈالتا ہے کہ کہیں موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا معاملہ وہ تو نہیں جو یونانی دیومالا میں سیسی فس کا بتایا گیا ہے۔

سبب اپنے اندر

قرآن میں اہل ایمان کو یہ یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ اگر تم ایمان اور ہدایت پر قائم رہو گے تو دوسروں کی مخالفانہ کارروائیاں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ اس سلسلہ میں دو آیتوں کا مطالعہ کیجئے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (المائدہ ۱۰۵)

اے ایمان والو، تم اپنی فکر رکھو۔ کسی کی گمراہی تم کو نقصان نہیں پہنچائے گی اگر تم ہدایت پر ہو۔

وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (آل عمران ۱۲۰)

اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ بے شک اللہ کے بس میں ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

قرآن کے اس اعلان کے مطابق، اہل ایمان کے لیے اصل قابل توجہ چیز ان کا داخل ہے نہ کہ ان کا خارج۔ اہل ایمان کو سب سے زیادہ جس چیز کا اہتمام کرنا ہے وہ یہ کہ وہ خدا کی ہدایت پر قائم رہیں۔ یہ ہدایت ربانی ان کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت پیدا کرے گی۔ اور صبر اور تقویٰ کی صفت ان کے لیے اغیار کی ضرر رسانی کے مقابلہ میں مانع بن جائے گی۔ صبر اور تقویٰ ان تمام تدبیروں اور سازشوں کے لیے ایک ناقابل تسخیر روک ہے جو امکانی طور پر دوسرے لوگ کر سکتے ہیں۔

دنیا میں کوئی شخص یا کوئی قوم تنہا نہیں۔ یہاں دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں۔ اور ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے آزادی عطا کی ہے۔ ہر آدمی اپنے مقصد کے لیے دوڑ رہا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے چوٹ لگتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی نقصان پیش آتا ہے۔ یہ صورت حال خود خدا کی قائم کردہ ہے۔ اس کو ختم کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ وہ جس طرح مسلم اور غیر مسلم کی مخلوط آبادی میں ہے اسی طرح وہاں بھی جاری رہے گی جہاں صرف مسلمان ہوں، اور کوئی دوسری قوم وہاں نہ پائی جاتی ہو۔

ایسی حالت میں مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ آدمی ہر ٹکرانے والے سے ٹکرائے۔ اس کا واحد حل وہی

ہے جس کو قرآن میں اعراض (Avoidance) کہا گیا ہے۔ اعراض ہی واحد تدبیر ہے جس کے ذریعہ کوئی شخص اس دنیا میں اپنا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتا ہے۔

صبر اسی اعراض کی قیمت ہے۔ جن لوگوں کے اندر صبر اور برداشت کا مادہ نہ ہو وہ اعراض نہیں کرسکتے، اور جو لوگ اعراض نہ کریں ان کے لیے اس دنیا میں کامیاب ہونا بھی ممکن نہیں۔

تاہم صبر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ صبر کے لیے آدمی کو اپنے مشتعل جذبات کو دبانا پڑتا ہے۔ صبر کا درجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی کھونے کو برداشت کرے۔ صبر کے طریقہ پر وہی آدمی چل سکتا ہے جو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ جائے۔

تقویٰ آدمی کے اندر یہی جوہر پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ سے مراد اللہ کا خوف ہے۔ عام آدمی لوگوں میں جیتا ہے۔ متقی آدمی لوگوں سے گزر کر خدا میں جینے لگتا ہے۔ متقی کی ساری توجہ اس پر لگ جاتی ہے کہ جو کچھ خدا سے ملنے والا ہے اس کو وہ نہ کھوئے۔ وہ بظاہر اسی دنیا میں ہوتا ہے مگر اپنے احساس کے اعتبار سے وہ دنیا سے اٹھ کر آخرت میں پہونچ جاتا ہے۔ اس طرح تقویٰ آدمی کو بے پناہ حد تک طاقتور بنا دیتا ہے۔ کوئی بھی حادثہ اس کے ذہنی استحکام کو منتشر نہیں کرتا۔ کوئی بھی نقصان اس کو اتنا بڑا نظر نہیں آتا جس کو وہ برداشت نہ کرسکے۔ یہ بلاشبہ اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ صفت پیدا ہو جائے ان کو تمام قومیں مل کر بھی زیر نہیں کرسکتیں۔

صبر اور تقویٰ کا ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ صبر کرنا اپنے آپ کو خدا کے حد پر روکے رکھنا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب دشمن کی دشمنانہ کارروائیوں پر بے صبر ہوتا ہے تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا سے بے خوف ہو کر حد سے باہر نکل جاتا ہے۔ وہ ایسے کام کرنے لگتا ہے جن سے خدا نے اس کو منع کیا تھا۔ مثلاً دشمن سے متنفر ہو کر اس سے اشتعال انگیزی کا سلوک کرنا، غصہ اور نفرت کی بنا پر فریق ثانی کے بارہ میں انصاف کی بات نہ کرنا، اپنی زیادتی کو گھٹانا اور دوسرا اگر زیادتی کرے تو اس کو بڑھا کر بیان کرنا، دشمنانہ فعل کسی اور نے کیا ہو اور اس کا بدلہ کسی اور سے لینا، حق کی حمایت کرنے کے بجائے قوم کی حمایت کرنا، وغیرہ۔

جو شخص تقویٰ پر ہو وہ خدا کی مدد سے ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور جو شخص تقویٰ کی حد پر قائم نہ رہے وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

داخلی مسئلہ

قرآن وحدیث میں نہایت واضح طور پر یہ بات بتائی گئی ہے کہ مسلمانوں پر جب بھی کوئی مصیبت آئے گی تو ان کی اپنی داخلی کمزوریوں کی بنا پر آئے گی۔ باہر کی کوئی طاقت انھیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں علمار اسلام نے یہ کیا کہ جب بھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی تو انھوں نے خود مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ تم اپنی اندرونی خرابیوں کی اصلاح کرو، کیوں کہ اپنی اندرونی خرابیوں کی اصلاح کرکے ہی تم بیرونی خطرات سے بچ سکتے ہو۔

۱۷۳۹ میں ایرانی حکمراں نادرشاہ نے ہندستان پر حملہ کیا اور دہلی کے مسلمانوں کو لوٹا اور ان کا قتل عام کیا۔ یہ بے حد سخت لمحہ تھا۔ لوگوں نے وقت کے بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناں سے اس کی شکایت کی۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ نادرشاہ پر ذمہ داری ڈال کر اس کو لعنت ملامت کرنے لگیں۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ فرمایا کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ ہماری اپنی ہی بداعمالیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے، اس لیے سب سے زیادہ اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ کرو۔ یہ در اصل خود ہمارے برے اعمال ہیں جنھوں نے نادر کی صورت اختیار کرلی ہے:

شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

ماہنامہ الفرقان (جولائی ۱۹۸۷) میں مولانا محمد منظور نعمانی کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے۔ بارہ صفحات کی یہ تقریر خاص اسی موضوع پر ہے۔ اس میں مولانا موصوف فرماتے ہیں:

" قرآن وحدیث کی روشنی میں یقین ہے کہ آج ہم مسلمانوں پر جو مصیبتیں جہاں بھی آرہی ہیں اور جو مظالم ہو رہے ہیں وہ سب ہماری بداعمالیوں اور نافرمانیوں کے نتائج ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: وماظلمناهم ولكن كانوا انفسهم يظلمون۔ ایک حدیث قدسی کے الفاظ ہیں: انما هي اعمالكم احصيها لكم۔ بدقسمتی سے اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جن مشکلات میں مسلمان مبتلا ہیں ان سے نجات پانے کے لیے ان کے ناخداشناس اور دین سے بے بہرہ قائد ورہنما ان قوموں کے طور طریقوں سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ایمان سے محروم ہیں۔ قرآن سے ہدایت اور رہنمائی حاصل

کرنے کا ان کو خیال بھی نہیں آتا، خدا کے لیے اس طریقہ کو بدلیے ورنہ حالات بد سے بدتر ہوتے رہیں گے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ہم پر ظلم نہیں ہو رہا ہے۔ ظلم ہو رہا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ ظلم اس ظلم کے نتیجہ میں ہو رہا ہے جو ہم اپنے اوپر کر رہے ہیں۔ اگر ہم کسی اعتبار سے ظالم نہ ہوتے، صرف مظلوم ہی ہوتے تو اللہ کی مدد آچکی ہوتی اور ہم پر ظلم کرنے والوں پر اللہ کی پکڑ آگئی ہوتی۔ ایک اور ظلم ہم اپنے اوپر یہ کر رہے ہیں کہ ہم جہاں رہتے ہیں وہاں کے لوگوں کو اپنا حریف اور دشمن سمجھ کر رہتے ہیں، بجائے اس کے کہ ہم ان کو اللہ کا بندہ سمجھتے اور محبت وحکمت اور اخلاق کے ساتھ ان کو اللہ کی رحمت سے اور ہدایت سے اور جنت سے قریب کرنے کی کوشش کرتے " (صفحہ ۱۹-۲۱)

ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے ایک عربی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام الرائد ہے۔ اس پرچہ کے شمارہ ۱-۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے: سرّ شقائنا فینا (ہماری بدبختی کا راز ہمارے اندر ہے) اس مضمون میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کی جڑ ان کی اپنی اخلاقی گراوٹ ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

ان المسلمین فقدوا سیر تہم المثالیۃ ----- فلو تصدیٰ ای شخص للعثور علی الرذائل الخلقیۃ کلھا مجتمعۃ فی امۃ لوجد افراد ھٰذہ الامۃ خیر مثال لھا علیٰ اختلاف الاجناس والالوان (صفحہ ۳)

اس عربی عبارت کا اردو ترجمہ خود ندوہ ہی کے دوسرے جریدہ تعمیر حیات (۲۵ اکتوبر ۱۹۸۷، صفحہ ۷) میں ان الفاظ میں چھپا ہے:

" اگر کوئی شخص تمام اخلاقی برائیوں کو یکجا طور پر دیکھنا چاہے تو اس کو سب سے واضح اور نمایاں مثال مسلمانوں ہی کی زندگی میں ملے گی۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کے لحاظ سے ان میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن برائیوں کے قبول کرنے میں غیر معمولی اتفاق نظر آتا ہے"

اسی بات کو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ان لفظوں میں بیان فرمایا: " مسلمانوں کی دنیوی مصائب وآفات اور عزت و دولت اور حکومت وغیرہ سے محرومی بھی ان کے برے اعمال کے نتائج اور تعلیمات قرآن وحدیث سے غفلت اور اعراض کے ثمرات ہیں " (تعمیر حیات ۲۵ اکتوبر ۸۷)

ناقص تجزیہ

ایک مشہور عالم اور قائد نے اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی ہے۔ اس میں وہ "الغار خلافت کا منحوس اقدام" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

"خلافت ایک دینی منصب اور اس کا قائم رکھنا مسلمانوں کا دینی فریضہ تھا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر وقفہ بھی خلیفۃ المسلمین کی موجودگی کے بغیر گذر سکتا تھا ...... لیکن بالآخر جو منصب جلیل وفات رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد سے کسی نہ کسی شکل میں اس وقت تک چلا آرہا تھا، اور عثمانیوں نے (اپنی ساری کمزوریوں اور بہت سی قابل گرفت باتوں کے باوجود) اس کی شان وشوکت قائم رکھی تھی اور یورپ کے دل پر اس کی دھاک بٹھا رکھی تھی اور جو حرمین شریفین کی پاسبان ومحافظ تھی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ میں اس کا کمال اتاترک کے (جس کا ہندستانی مسلمان اپنی ناواقفیت کی بنا پر عرصہ تک کلمہ پڑھتے رہے تھے) ہاتھوں بیک گردش قلم وجنبش لب خاتمہ ہوگیا۔ اگر پوچھا جائے کہ عالم اسلام کے لئے آخری صدیوں کی طویل تاریخ میں منحوس ترین دن کون تھا؟ تو ایک باخبر اور حقیقت پسند مورخ اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتا کہ ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ کی تاریخ تھی جب ٹرکی کی مجلس وطنی (پارلیمنٹ) نے الغار خلافت کا فیصلہ کیا اور مقامات مقدسہ ہی نہیں مسلمانوں کی عزت وآبرو کا وہ مضبوط حصار ٹوٹ گیا جس کو ترکوں نے اپنی قربانیوں، فوجی طاقت اور خلافت کے مقدس نام سے تعمیر کیا تھا" (کاروان حیات صفحہ ۷۴ - ۷۵)

یہ تاریخ کا بے حد ناقص مطالعہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ ایک شخص نے مسلمانان عالم کے سیاسی ادارہ (خلافت) کو ختم کر دیا یا ایک شخص اس کو ختم کر سکتا تھا۔ اس قسم کے واقعات وسیع تر تاریخی عوامل کے تحت ہوتے ہیں نہ کہ کسی فرد واحد کی کارروائی کے تحت۔

مذکورہ عالم اور قائد ایک بہت بڑی اسلامی درس گاہ کے ناظم ہیں۔ اگر وہ کسی دن اعلان کر دیں کہ آج سے یہ درس گاہ ختم کی جاتی ہے تو کیا وہ ختم ہو جائے گی۔ یا وہ اعلان کریں کہ اب یہ اسلامی تعلیم کی درس گاہ نہیں ہوگی بلکہ یہاں ہندو ازم اور بدھ ازم کی تعلیم دی جائے گی تو ان کے اعلان کی بنا پر کیا یہ اسلامی درس گاہ ہندو درس گاہ بن جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی "اتاترک" خلافت اسلامی کے عالمی ادارہ کو محض اپنے فیصلہ سے ختم کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اسلامی کا ادارہ اس لئے ختم ہوا کہ تاریخی حالات نے اس کو ختم

کر دیا تھا۔ اتاترک نے صرف ایک ہونے والے واقعہ کا اعلان کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۴ تک عثمانی خلافت کے ماتحت مسلم ممالک میں قومی تحریکیں زبردست قوت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ تحریکیں شدت کے اس درجہ تک پہنچ چکی تھیں کہ ترکی میں بیٹھ کر ان ممالک پر حکومت کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ گویا تقریباً وہی صورت حال تھی جو موجودہ صدی کے وسط میں برطانیہ کے لئے ہندستان میں پیدا ہو چکی تھی۔ برطانی وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے ہندستان کو برطانی غلامی سے آزاد نہیں کیا بلکہ ایک ہونے والے واقعہ کا سیاسی اعتراف کر لیا۔ اسی طرح کمال اتاترک نے حقیقۃً خلافت کو ختم نہیں کیا بلکہ وہ خلافت جس کو اس کے ماتحت مسلم ممالک اپنے قومی جوش کے تحت قبول کرنے سے انکار کر چکے تھے اس کو مان لیا اور ان ملکوں کی خواہش کے مطابق انھیں قومی آزادی دے دی۔

اس زمانہ میں عرب ممالک قومی جذبات سے اس قدر سرشار تھے کہ ان کے درمیان اگر کوئی سمجھ دار آدمی خلافت کو باقی رکھنے کی بات کرتا تو وہ اس کو قومی غدار سمجھ لیتے۔ ایک بڑے عرب عالم جو خلافت کی ماتحتی کو باقی رکھنا چاہتے تھے جب ان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑا تو انھوں نے کہا :

سیعلم قومی انی لا اغشہم

ومہما استطال اللیل فالصبح واصل

جلد ہی میری قوم جان لے گی کہ میں نے اس کو دھوکا نہیں دیا ہے اور رات کتنی ہی لمبی ہو بہر حال اس کے بعد صبح آتی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو لیڈر اٹھے انھوں نے حالات کا تجزیہ کرنے میں کتنی زبردست غلطیاں کیں۔ اور جب تجزیہ غلط ہو تو لازمی طور پر عملی پروگرام بھی غلط اور بے نتیجہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر مسلم لیڈر کسی نہ کسی فرد کو مسلم مصائب کا ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف طوفان مچاتے رہتے ہیں۔ مگر جب وہ اس فرد کو ختم کر لیتے ہیں یا اس کو سولی پر چڑھا دیتے ہیں تو اس کے بعد بھی مسائل بدستور باقی رہتے ہیں۔ جن لوگوں کے بس میں قتل کرنا ہے وہ قتل کر رہے ہیں۔ جن کے پاس قتل کرنے کی طاقت نہیں وہ مفروضہ ذمہ دار شخص کے خلاف الفاظ کا طوفان مچائے ہوئے ہیں۔

ہمارے مسائل کسی فرد کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ وہ وسیع تر تاریخی اسباب کے پیدا کردہ ہیں۔ اور جب تک ان تاریخی اسباب کو دور نہ کیا جائے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اردو صحافت اور اخلاقیات

اردو صحافت اور اخلاقیات ـــــ باعتبار واقعہ ایک متضاد ترکیب ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ غضبناک آدمی اور خوش اخلاقی، نیم کی پتی اور شیرینی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقیات ایک مثبت رویہ کا نام ہے، اور اردو صحافت بطور واقعہ کبھی مثبت چیز تھی ہی نہیں۔ اردو صحافت تمام تر ردعمل کے طور پر ظہور میں آئی۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ ردعمل ہی کے رویہ کا دوسرا نام منفی رویہ ہے۔

لکھنؤ کے ایک مسلم اخبار (قائد) نے ایک بار اردو صحافت کی پالیسی کو احتجاجی پالیسی کا عنوان دیا تھا۔ اخبار مذکور نے یہ بات بطور فخر کہی تھی، مگر میں اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ صحیح ترین لفظ ہے جو اردو صحافت کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ اردو صحافت بنیادی طور پر ایک احتجاجی صحافت ہے۔ اور احتجاجی صحافت بلاشبہ اخلاقیات کی نفی ہے۔ اردو صحافت مسلم مسائل کو پیش کرنے کے لیے وجود میں آئی نہ کہ حقیقت واقعہ کو بیان کرنے کے لیے۔ گویا کہ موجودہ اردو اخبارات مسلمانوں کے صحافی وکیل ہیں۔ وہ حقیقت کو غیر جانبدارانہ طور پر بیان کرنے والے نقیب نہیں۔

"اخلاقیات" ایک مثبت اصطلاح ہے۔ اگر میں اخباری اخلاقیات کا تعین کروں تو اس کے اجزا سادہ طور پر غالباً حسب ذیل ہوں گے:

۱۔ مثبت نقطۂ نظر کا حامل ہونا، ایسا نقطۂ نظر جو کسی قسم کے مخالفانہ حالات سے بطور ردعمل نہ بنا ہو، بلکہ خود اپنی ایجابی غور و فکر سے وجود میں آیا ہو۔

۲۔ حالات کی مطابقِ واقعہ رپورٹنگ۔

۳۔ قومی اور بین اقوامی مسائل کا منصفانہ تجزیہ۔

اب میں ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے اردو صحافت پر مختصراً اظہار خیال کروں گا۔

مثبت نقطۂ نظر کا فقدان

اردو صحافت کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ اس کے بانیوں اور معماروں نے انسانی حقیقتوں پر غور کیا۔ انھیں اس قسم کی کوئی ابدی حقیقت دریافت ہوئی جیسی حقیقت ایک سائنس داں دریافت کرتا ہے اور پھر یہ لوگ اس دریافت سے بے چین ہو کر اس کے اظہار کے لیے صحافت

کے میدان میں داخل ہوگیے۔ اس کے برعکس اردو صحافت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے تقریباً تمام صحافی جس "اسکول آف جرنلزم" میں بنے وہ ان کے وقتی حالات تھے۔ وہ اپنے وقتی اور قریبی حالات سے متاثر ہوئے اور اس کے بعد وہ اپنی جوابی نفسیات کے اظہار کے لیے صحافت کے میدان میں کود پڑے۔ ان میں سے کسی نے اپنے اخبار کا نام سیدھے طور پر "ندائے ملت" رکھ دیا اور کسی نے بظاہر دوسرا نام رکھا۔ مگر ہمارا ہر اخبار حقیقتہً ندائے ملت ہوتا ہے نہ کہ ندائے حقیقت۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ اردو صحافت، وہ اردو صحافت جس کی نمائندگی اس ملک میں مسلمانوں نے کی ہے، وہ اپنے آغاز ہی سے ردعمل کی پیداوار رہی ہے۔ مسلمانوں کے تمام اردو اخبارات کسی نہ کسی "دشمن اسلام" کے خلاف ردِّ عمل کے طور پر وجود میں آئے۔ دہلی کے ایک اخبار نے اپنے صفحۂ اوّل کی ایک جلی سُرخی ان الفاظ میں قائم کی تھی:

"آگ اور خون میں نہائے ہوئے مسلمان سوال کرتے ہیں"

یہ سرخی بتاتی ہے کہ اردو اخبارات کس قسم کے ذہن کے تحت چلائے جارہے ہیں۔ وہ ذہن یہی ہے کہ وہ "خون آلود" مسلمانوں کے نمائندہ بن کر ان کی طرف سے ان کے "مفروضہ" دشمنوں کے خلاف مضامین اور خبریں چھاپتے رہیں۔ اردو صحافت ایک قسم کی وکیلانہ صحافت ہے نہ کہ کوئی اخلاقی صحافت۔

وکیلانہ رویہ اور اخلاقی رویہ میں یہ فرق ہے کہ وکیل صرف اپنے مؤکل کو دیکھتا ہے اور اخلاقی رویہ کی نگاہ ہمیشہ وسیع تر حقیقتوں کی طرف ہوتی ہے۔ وکیل محدود مفاد کا نمائندہ ہوتا ہے اور اخلاق آفاقی صداقت کا نمائندہ۔

یہ بات اردو صحافت میں اتنی زیادہ عام ہے کہ وہی اخبارات سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ وکیلانہ رویہ کا مظاہرہ کریں۔ لکھنؤ کا ایک اخبار جس کی اشاعت ۱۹۶۵ میں بمشکل ایک ہزار تھی وہ ۶۸-۱۹۶۷ میں مخالف کانگرس تحریک (Non-Congressism) میں شریک ہوگیا۔ اس نے دھواں دھار طور پر مسلمانوں کی موافقت اور "فرقہ پرست حکومت" کی مخالفت شروع کردی۔ وہ نام نہاد "معاہداتی سیاست" کا نقیب بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اشاعت اچانک ایک ہزار سے بڑھ کر سولہ ہزار تک پہونچ گئی۔ بعد کو جب معاہداتی سیاست ناکام ہوگئی تو اس اخبار کی اشاعت دوبارہ ایک ہزار سے بھی کم تھی۔

اردو صحافت اپنے اس مزاج کی وجہ سے محض ایک قوم کی صحافت بن کر رہ گئی ہے۔ قومی صحافت کا اصول یہ ہوتا ہے: "میری قوم، صحیح یا غلط"۔ اس کے برعکس اخلاقی صحافت کا اصول یہ ہوتا ہے: "عالمی صداقت، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف"۔ اخلاقی اعتبار سے یہ کسی صحافت کی بنیادی خامی ہے اور اردو صحافت بلاشبہ اس خامی کی بدترین مثال ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد انگریزی حکومت کے خلاف ردعمل کی پیداوار تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کا اخبار اہل حدیث قادیانیوں، آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں کے خلاف ایک صحافتی محاذ قائم کرنے کا دوسرا نام تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا صدق مغربی تہذیب کے خلاف نوک جھونک کا صحافتی میدان تھا۔ دہلی کے مشہور اردو صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف تیز و تند مضامین لکھتے تھے جس کی نمائندگی مشہور فرقہ پرست اخبار پرتاپ کرتا رہا ہے۔ وغیرہ

مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمین دار میں ایک بار پُرفخر طور پر یہ شعر چھاپا تھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

یہی موجودہ زمانہ میں تمام اردو صحافیوں کا حال رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک فرضی "پانی پت" تھا۔ ہر ایک اپنے مفروضہ پانی پت کے میدان میں اپنے خیالی دشمن کو قلمی شکست دے کر فتح کی خوشی مناتا رہا۔

ہندستان کی اردو صحافت کی پوری تاریخ میں، میری معلومات کے مطابق، اس اعتبار سے صرف ایک قابل ذکر استثنا رہے اور وہ سرسید کے تہذیب الاخلاق کا ہے۔ تہذیب الاخلاق کو اگرچہ میں مکمل معنوں میں نہیں، تاہم ۵۰ فی صد مثبت صحافت سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ تہذیب الاخلاق کی بنیاد، دوسرے اردو جرائد کی طرح اغیار کے خلاف احتجاج پر نہ تھی۔ بلکہ اپنی قوم کی اصلاح و تعمیر کے مثبت جذبہ پر تھی۔

اردو صحافت میں غالباً سرسید پہلے قابل ذکر شخص ہیں جنھوں نے یہ بتایا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی اپنی غفلت کا مسئلہ ہے نہ کہ دوسروں کے ظلم اور تعصب کا مسئلہ۔ میرے اپنے الفاظ میں سرسید

کے فکر کا خلاصہ یہ تھا کہ ــــ مسلمان موجودہ زمانہ کے علوم میں پیچھے ہوگئے ہیں، اس لیے وہ زمانی شعور میں بھی پیچھے ہیں۔ جب تک وہ زمانی شعور کے اعتبار سے زمانہ کی سطح پر نہ آجائیں وہ آج کی دنیا میں اپنے لیے باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

میرے نزدیک یہی وہ چیز ہے جہاں سے اخلاقیات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص یا گروہ خود اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ان اللّٰہ لایغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ مولانا حالی نے اس آیت کے مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کو بدلنے کا

یہ دنیا کے بارہ میں خدا کا قانون ہے۔ ایسی حالت میں صحیح اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ اپنے مسائل کی ذمہ داری خود قبول کی جائے۔ جو چیز اپنی غفلت سے پیدا ہوئی ہے اس کی ذمہ داری خود قبول کرنے کا نام اخلاق ہے اور اپنی غفلت سے پیدا شدہ نتائج کو دوسروں کے اوپر ڈالنا، یہی وہ چیز ہے جس کو غیر اخلاقی فعل کہتے ہیں۔

بد قسمتی سے اکثر اردو صحافیوں کا معاملہ اس اعتبار سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ عام صحافیوں نے مسلمانوں کو یا تو اغیار کے ظلم کی مبالغہ آمیز داستانیں سنائیں جس کا نتیجہ صرف نفرت تھا۔ یا انھوں نے ماضی کی عظمت کے قصیدے پڑھے جس کا واحد ممکن انجام صرف یہ تھا کہ مسلمان جھوٹے فخر میں مبتلا ہو جائیں جو چیز اپنی نہیں ہے اس کو "اپنے اسلاف" کی لفظی منطق سے اپنی بنا کر فرضی طور پر خوش ہوتے رہیں۔

مطابق واقعہ رپورٹنگ

صحافتی اخلاقیات کی ایک اہم خصوصیت مطابق واقعہ رپورٹنگ ہے۔ یعنی حالات و واقعات کو ٹھیک ویسا ہی بیان کرنا جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اس معاملہ میں اردو صحافت سب سے زیادہ ناقابل اعتبار صحافت ہے۔ اردو اخبارات کی رپورٹنگ نہ صرف یک طرفہ ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے وکیلانہ مزاج کی وجہ سے وہ اکثر غلط بھی ہوتی ہے۔

اردو صحافت کا بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے ظلم کے خلاف رد عمل کے طور پر ظہور میں آئی۔ چنانچہ پوری اردو صحافت مستقل طور پر ایک قسم کے احساس مظلومی

(Persecution complex) میں مبتلا رہتی ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو لوگ احساس مظلومی میں مبتلا ہوں وہ کبھی واقعات کو ہو بہو (As it is) پیش نہیں کر سکتے۔ وہ عین اپنی نفسیات کے تحت ہمیشہ واقعات کو اس طرح پیش کریں گے جس میں دوسرے لوگ ظالم کے روپ میں نظر آئیں اور خود ان کا اپنا وجود ان کی بنائی ہوئی تصویر میں مظلوم دکھائی دیتا ہو۔

احساس مظلومی میں مبتلا شخص کبھی واقعات کی غیر جانبدارانہ تحقیق نہیں کرتا۔ وہ واقعات کو جج کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ فریق کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ دوطرفہ نقطۂ نظر سے حالات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ یک طرفہ طور پر پیدا ہونے والے جذبات کے تحت رائے قائم کر کے فوراً اس کے مطابق لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اخبارات کی رپورٹیں یا تو یک طرفہ طور پر مسلم جذبات کو سامنے رکھ کر مرتب کی جاتی ہیں یا پھر ان میں بعض جزئی یا استثنائی واقعات کی تعمیم (Generalisation) ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں دیانت دارانہ رپورٹنگ کے خلاف ہیں۔

ایک مثال

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مارکسی پروفیسر عرفان حبیب پر یونیورسٹی کے کچھ مسلمان لڑکوں نے حملہ کیا۔ اس کے بعد دہلی کے ایک انگریزی اخبار کا رپورٹر علی گڑھ پہونچا۔ اس نے مذکورہ مارکسی پروفیسر کا انٹرویو لیا جو انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۳ جنوری ۱۹۸۱) میں چھپا۔ اس انٹرویو کے چھپنے کے بعد یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ اور زیادہ مشتعل ہو گیے۔ انھوں نے یونیورسٹی کیمپس میں توڑ پھوڑ اور اودھم بازی شروع کر دی، یہاں تک کہ یونیورسٹی بند ہونے کی نوبت آگئی۔

انھیں دنوں دلی کے ایک اردو ہفت وار کے ایڈیٹر ہمارے دفتر میں آئے۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ آج شام کو ہمارے اخبار کی کاپی پریس جا رہی ہے اور مجھے فوری طور پر علیگڑھ کے بارہ میں ایک اداریہ لکھنا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے پروفیسر حبیب کا وہ انٹرویو پڑھا ہے جس کی بنیاد پر یہ ہنگامے ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ جب آپ نے اصل انٹرویو کو نہیں پڑھا تو آپ اس کے بارہ میں اداریہ کیسے لکھیں گے۔ "ہم چپ رہیں گے تو ہم مسلم عوام سے کٹ جائیں گے" انھوں نے کہا اور باہر چلے گیے۔ ان کا اخبار میرے پاس آیا تو اس میں علی گڑھ کے بارے میں ایک پرشور اداریہ موجود تھا۔

اس کے بعد مجھے خود اس موضوع پر لکھنے کی فکر ہوئی۔ میں نے چاہا کہ سب سے پہلے میں پروفیسر

عرفان حبیب کا مطبوعہ انٹرویو پڑھوں۔ اس سلسلہ میں میں نے متعدد اردو اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سے معلوم کیا اور انھیں ٹیلی فون کیے۔ مگر نہ تو کسی کے پاس انڈین اکسپریس کا مطبوعہ پرچہ موجود تھا اور نہ ایسے لوگ ملے جو یہ کہیں کہ انھوں نے مذکورہ انٹرویو پورا کا پورا پڑھا ہے۔ حالاں کہ یہ تمام اخبارات وہ تھے جو پروفیسر عرفان حبیب کے خلاف اور علیگڑھ کے مسلم طلبہ کی حمایت میں پرشور مضامین اور خطوط شائع کر رہے تھے۔ اس موضوع پر اس زمانہ میں تقریباً ہر اردو اخبار نے لکھا تھا۔ مگر کسی ایک اخبار نے بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ پروفیسر عرفان حبیب کے متنازعہ انٹرویو کا مکمل ترجمہ چھاپے تاکہ اردو قارئین اصل انٹرویو کو پڑھ کر کوئی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہوسکیں۔ ہر ایک صرف اپنا تبصرہ چھاپ رہا تھا، متنازعہ انٹرویو کسی نے بھی نہیں چھاپا۔

آخر کار میں اس کی تلاش میں انڈین اکسپریس کے دفتر گیا۔ وہاں اخبار کی فائل نکلوا کر پروفیسر عرفان حبیب کا مذکورہ انٹرویو پڑھا۔ اس کی فوٹو کاپی لی۔ اور پھر اس کے بارے میں دو صفحہ کا ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ الرسالہ (اگست ۱۹۸۱) میں چھپ چکا ہے۔ میرے اس مضمون کا عنوان تھا ——— "آہ یہ بے شعوری"

پروفیسر عرفان حبیب کے اس مطبوعہ انٹرویو کو آپ پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جس پر مشتعل ہونے کی ضرورت ہو۔ اس انٹرویو کا خلاصہ یہ ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو تعلیم سے زیادہ ہنگامہ بازی میں دل چسپی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عین وہی واقعہ تھا جس کی تصدیق خود ان طلبہ نے انٹرویو کے بعد یونیورسٹی میں اپنے پر تشدد ہنگاموں سے عملی طور پر فراہم کردی۔

ایک مسلمان ایڈیٹر صاحب جنھوں نے اصل انٹرویو کا خلاصہ پڑھا تھا، ان سے میں نے کہا کہ آپ انٹرویو کے خلاف مسلسل مضامین چھاپ رہے ہیں، پھر آپ اصل انٹرویو کو کیوں نہیں چھاپتے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم انٹرویو کو بجنسہ چھاپ دیں تو طلبہ کی مہم کمزور پڑ جائے گی۔ کیوں کہ اصل انٹرویو میں کوئی بہت زیادہ قابل اعتراض بات نہیں۔ گویا معاملہ حق اور ناحق کا نہیں۔ بلکہ اپنی قوم کی یک طرفہ حمایت کرنے کا ہے۔ اور اپنی قوم کی یہ یک طرفہ حمایت وہ لوگ کر رہے ہیں جو مغربی قومیت کے اس تصور کا مذاق اڑاتے ہیں کہ میری قوم، خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔

My country, right or wrong.

کیا اخلاق اسی کا نام ہے۔ اگر یہ اخلاق ہو تو دوسری کون سی چیز دنیا میں ہے جس کو اخلاق کے خلاف کہا جائے۔

جھوٹی شکایت

اردو اخبارات کی رپورٹیں اور مضامین خواہ وہ جس موضوع پر بھی ہوں، ان کا مشترک خلاصہ صرف ایک ہوتا ہے۔ اور وہ ہے جھوٹی شکایت۔ دوسروں کے بارہ میں جھوٹی شکایت ہمارے اخبارات کا سب سے زیادہ محبوب موضوع ہے۔

ان شکایتوں کو میں جھوٹی شکایت کیوں کہتا ہوں، اس کی ایک مثال لیجئے۔ ہمارے تمام اردو اخبارات مشترک طور پر اس بات کے شاکی ہیں کہ ملک کا قومی پریس (بڑے بڑے انگریزی اخبارات) مسلم معاملات کی صحیح رپورٹنگ نہیں کرتے۔ ہر اردو اخبار بلا ناغہ اس شکایت کو کسی نہ کسی شکل میں دہراتا رہتا ہے۔

مگر یہ شکایت سراسر بے معنی ہے۔ پہلی بات یہ کہ قومی پریس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ پوری ہندستانی قوم کی مشترک ملکیت ہے۔ وہ قومی پریس صرف اس معنی میں ہے کہ وہ پورے ملک میں پڑھا جاتا ہے۔ وہ اردو اخبارات کی طرح صرف ایک فرقہ کا اخبار (کمیونٹی پیپر) نہیں۔ پھر ان اخبارات میں جب دوسروں کا پیسہ لگا ہوا ہے، جب دوسروں کے ذہن ان کو چلا رہے ہیں۔ اور دوسرے ہی لوگ ان کے اصل خریدار ہیں تو ایسے اخبارات آخر مسلم جذبات کی نمایندگی کیوں کریں گے۔ اسباب کی اس دنیا میں یہ سراسر غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی کہ جن اخبارات کو تمام تر دوسرے لوگ چلا رہے ہوں ان سے ہم یہ امید رکھیں کہ وہ ہمارے اپنے جذبات کی ترجمانی کریں گے۔

اس مطالبہ کے پیچھے دوسرا زور اخلاقی زور ہو سکتا تھا۔ یعنی ہم اپنے اردو اخبارات میں دوسروں کی باتوں کی صحیح ترجمانی کر رہے ہوں۔ اگر ہم فی الواقع ایسا کریں تو کم از کم اخلاقی طور پر ہمیں یہ امید رکھنے کا حق ہے کہ دوسرے بھی اپنے اخبارات میں ہماری باتوں کی صحیح ترجمانی کریں گے۔

مگر بدقسمتی سے ہمارے مطالبہ کے پیچھے یہ اخلاقی زور بھی موجود نہیں۔ کیوں کہ اس معاملہ میں اردو اخبارات کا حال انگریزی اخبارات سے بھی زیادہ برا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو اخبارات

میں دوسروں کی باتیں نہایت بگڑی ہوئی شکل میں پیش کی جاتی ہیں۔ پھر دوسرے بھی اگر اپنے اخبارات میں ایسا ہی کریں تو ہمیں ان سے شکایت کرنے کا کیا حق۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے یہاں میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

شیوسینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے نے ۲۱ اپریل ۱۹۸۴ کو بمبئی میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر اردو اخبارات میں اشتعال انگیز سرخیوں کے ساتھ چھپی۔ اس کے بعد اس علاقہ کے مسلمان بھڑک اٹھے یہاں تک کہ مئی ۱۹۸۴ میں بھیونڈی اور بمبئی کے فسادات ہوئے جس میں مسلمانوں کا زبردست نقصان ہوا۔

مسٹر بال ٹھاکرے کی اس تقریر کے بارے میں ہر اردو اخبار یہ لکھ رہا تھا کہ اس میں پیغمبر اسلام کی توہین کی گئی ہے۔ ایک اردو اخبار نے اس تقریر کے اوپر حسب ذیل سُرخی لگائی:

مسلمانوں کے پیغمبر ہمارا بول و براز صاف کرتے تھے: ٹھاکرے کی دریدہ دہنی

مگر یہ ساری باتیں خود ساختہ رپورٹ کی بنیاد پر ہو رہی تھیں۔ میں نے بہت سے صحافیوں سے پوچھا کہ کیا آپ نے بال ٹھاکرے کی تقریر کا متن پڑھا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے پوچھا، کیا آپ نے اس تقریر کا ٹیپ سنا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے پوچھا، کیا آپ نے بال ٹھاکرے کا وہ انٹرویو دیکھا ہے جو انگریزی ہفتہ وار (Link) ۳ جون ۱۹۸۴ میں چھپا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ کیسا اسلام ہے کہ آپ بلا تحقیق اس کے خلاف اخباری محاذ قائم کیے ہوئے ہیں۔

میری عادت ہے کہ میں براہ راست تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کہتا۔ چنانچہ میں نے ہفتہ وار لنک کا مذکورہ شمارہ حاصل کیا۔ اس کو مکمل پڑھا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ الرسالہ (ستمبر ۱۹۸۴) میں چھپ چکا ہے۔

مذکورہ شائع شدہ انٹرویو کے مطابق بال ٹھاکرے نے کوئی قابل اعتراض بات نہیں کہی۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے صحیح بخاری کی ایک روایت اپنے الفاظ میں نقل کی۔ اس روایت میں حضرت ابوہریرہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مدینہ کی مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے۔ اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر پانی بہا دو۔ کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گیے ہو، تم مشکل پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجے گیے۔

مسٹر بال ٹھاکرے نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہا کہ دیکھو مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کا یہ حال تھا، مگر اب مسلمانوں میں اس قسم کی برداشت کہاں ہے:

But where is that kind of tolerance in this community now.

مسٹر بال ٹھاکرے کا یہ مطبوعہ انٹرویو کسی بھی اردو اخبار میں نقل نہیں کیا گیا۔ البتہ اس کے بعد ہر اردو اخبار نے بلا کان مسٹر بال ٹھاکرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اردو اخبارات نے مسٹر بال ٹھاکرے کی بات کو نہایت بگڑی ہوئی صورت میں پیش کیا اور اس پر پرشور تبصرے کیے۔ اردو اخبارات نے بال ٹھاکرے کی بات کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ کیا اس کے بعد بھی ہم کو یہ حق ہے کہ ہم دوسروں کے جاری کردہ اخبارات سے یہ تقاضا کریں کہ وہ ہمارے معاملات کی ترجمانی صحیح انداز سے کریں۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے کہ اردو صحافت اور اخلاقیات دونوں دو متضاد چیزیں ہیں جو کم از کم اب تک ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہوئیں۔

منصفانہ تجزیہ نہیں

صحافی اخلاقیات کا ایک جز منصفانہ تجزیہ اور حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے۔ مگر اردو صحافت میں منصفانہ تجزیہ اتنا کم یاب ہے کہ بدرجہ امکان ہی اس کے وجود کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ منفی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ کبھی مسائل کو بے لاگ انداز سے دیکھ نہیں سکتے، اور جو لوگ مسائل کو بے لاگ انداز سے نہ دیکھ سکیں ان کے لیے یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ مسائل کا منصفانہ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں۔ اردو صحافت اس اصول کی بدترین مثال ہے۔

اردو زبان میں آج ہزاروں اخبار نکلتے ہیں اور ہر اخبار اپنی ہر اشاعت میں ایک اداریہ بھی ضرور شائع کرتا ہے۔ مگر یہ اداریے بمشکل ہی اس قابل ہوتے ہیں کہ کوئی پڑھنے والا ان کو پڑھے۔ ان تمام اداریوں کا ایک مشترک عنوان دینا ہو تو وہ "چیخ پکار" ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفروضہ تعصب اور امتیاز کے خلاف چیخ پکار کے سوا اردو اخبارات کے پاس کوئی اور بات ہی نہیں جس کو وہ اپنے تبصروں کا موضوع بنائیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں سے صرف کچھ سطحی لوگ دلچسپی لے سکتے ہیں، سنجیدہ لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجیے۔

مئی ۱۹۸۵ میں یہ واقعہ ہوا کہ چاندمل چوپڑا نامی ایک شخص نے کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن کے خلاف ایک رٹ پٹیشن داخل کیا۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ قرآن تشدد کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے اس ملک میں اس کی اشاعت اور تقسیم کو قانونی طور پر بند کر دیا جائے۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے اس پٹیشن کو سماعت کے لیے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو جسٹس بی سی باسک نے وہ تاریخی فیصلہ دیا جو تمام اخبارات میں چھپ چکا ہے۔

اس کیس کے بارے میں حسب معمول اردو اخبارات میں پرشور مضامین چھپے۔ ان میں ایسے بھی تھے جنھوں نے اس قسم کی زبان استعمال کی کہ "چوپڑا کا کھوپڑا خراب ہوگیا ہے" اور ایسے بھی تھے جنھوں نے اس سے مختلف زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ تاہم سب کا مشترک خلاصہ ایک تھا ــــــ اس کے خلاف اندھا دھند احتجاج۔

کلکتہ ہائی کورٹ کے فیصلہ کے کئی ماہ بعد ستمبر ۱۹۸۵ میں ایک اردو جریدہ نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا :

"یہ ایک بڑا خوفناک واقعہ ہے جو پچھلے دنوں ہوا۔ عدالت نے اس استغاثہ پر کوئی باقاعدہ فیصلہ دینے کے بجائے معاملہ کو گول مول چھوڑ کر اس کو اپنے ریمارکس کے ساتھ محض روک دیا۔ گویا شرارت کا دروازہ اب بھی بند نہیں ہے"

جن لوگوں نے اصل فیصلہ کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو جریدہ کے یہ الفاظ سراسر واقعہ کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کلکتہ ہائی کورٹ نے معاملہ کو گول مول نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس کو قطعی طور پر خارج کر دیا۔ جسٹس بمل چندر باسک کے ۱۸ صفحات کے فیصلہ کے آخر میں پیراگراف نمبر ۴۰ کو پڑھیے۔ اس میں واضح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں :

For the aforesaid reasons this application stands dismissed.

یعنی مذکورہ حقائق کی بنا پر یہ درخواست ڈسمس کی جاتی ہے۔

یہ اخلاق کی کون سی قسم ہے کہ عدالت کے ایک صحیح فیصلہ کا اعتراف نہ کیا جائے اور اس کے بارہ میں ایسے الفاظ لکھے جائیں جس سے اس کا وقار غیر ضروری طور پر مجروح ہوتا ہو۔ اس قسم کے صحافتی تبصرہ کو صحافتی تبصرہ کے بجائے صحافتی الزام کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

غیر تعمیری ذوق

۱۹۶۸ میں راقم الحروف نے لکھنؤ کے ایک ہفت روزہ میں ایک کالم لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کالم میں میں نے مسلمانوں کے اندر "اپنی تعمیر آپ" کا ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس کا ایک نمونہ ماہنامہ الرسالہ کے قارئین الرسالہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ چند اشاعتوں کے بعد میرے بھیجے ہوئے مضامین مجھے بذریعہ ڈاک واپس کر دیئے گیے۔ ان مضامین کے ساتھ اخبار کے ایڈیٹر کا ایک خط تھا جس میں لکھا ہوا تھا:

"آپ کے مضامین ہمارے اخبار میں کھپ نہیں رہے ہیں۔"

اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ اخبار اس زمانہ میں پرشور طور پر احتجاجی سیاست چلا رہا تھا۔ احتجاجی سیاست کا مطلب اپنے مسائل کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے کر ان کے خلاف مطالبہ کی مہم چلانا ہے۔ جب کہ میں اپنے مضامین میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا تھا کہ مسلمانوں کا مسئلہ موجودہ زمانہ میں خود اپنی غفلت سے پیدا ہوا ہے، اور مسلمان اپنی تعمیر آپ کر کے ہی اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ قسم کی احتجاجی سیاست کے خانہ میں میرے تعمیری مضامین بالکل بے جوڑ تھے، چنانچہ محترم ایڈیٹر صاحب نے ان کو چھاپنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ جو لوگ اس قسم کا غیر حقیقت پسندانہ ذہن رکھتے ہوں وہ کبھی مسائل کا منصفانہ تجزیہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جدید اردو صحافت میں مجھے صرف ایک بزرگ معلوم ہیں جن کا ذکر میں اس اعتبار سے کر سکتا ہوں کہ وہ حقیقت پسندانہ اداریہ لکھنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آصف حسین قدوائی ہیں۔ وہ پندرہ سال پہلے لکھنؤ کے ایک ہفتہ وار اخبار میں پابندی کے ساتھ اداریے اور تبصرے لکھتے تھے۔ اہل علم طبقہ میں ان کے یہ مضامین نہایت اہتمام سے پڑھے جاتے تھے۔ میں خود پابندی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتا تھا۔

ڈاکٹر آصف حسین قدوائی کے مضامین کی نوعیت کو بتانے کے لیے میں ایک چھوٹی سی مثال دوں گا۔ ایک بار انھوں نے ہندستان کی مسلم سیاست پر ایک مفصل اداریہ لکھا۔ اس کا پہلا جملہ تھا:

"ریاست ممکنات کا کھیل ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جملہ اتنا قیمتی ہے کہ دورِ جدید کی تمام اردو صحافت پر بھاری ہے۔ مگر ڈاکٹر قدوائی کا بھی وہی انجام ہوا جو میرے تعمیری مضامین کا ہوا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مذکورہ اخبار سے الگ

تشویہ حقائق

دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنو) سے ایک عربی اخبار نکلتا ہے جس کا نام الرّائد ہے۔ اس کے شمارہ ۲۱ صفر ۱۴۰۸ھ (۱۶ اکتوبر ۱۹۸۷) میں صفحہ اول پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اسلام کے معاندین اسلام کو پیش کرنے میں جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، اس کو اس مضمون میں بجا طور پر تشویہ الحقائق سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی حقیقتوں کو مسخ کرکے پیش کرنا۔

معاندین اسلام کا یہی عام طریقہ ہے جو دور اول کے یہود سے لے کر موجودہ زمانہ کے مستشرقین تک میں پایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ وہ اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے حقیقت کو اس کی اصلی اور واقعی صورت میں پیش کیا تو وہ لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اس لیے وہ اسلام کی تعلیم یا اسلام کی تاریخ کو بگاڑ کر خود ساختہ صورت میں پیش کرتے ہیں تاکہ آسانی کے ساتھ اس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا جاسکے۔

مثال کے طور پر ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو اگر سادہ طور پر "ہجرت" کہا جائے تو اس سے یہ تصور سامنے آتا ہے کہ یہ مقام عمل کی تبدیلی تھی جو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت کی گئی۔ مگر معاندین اسلام بالقصد اس کے لیے ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں جو فرار کے ہم معنی ہو۔ اس طرح ہجرت کا مفہوم بالکل بدل جاتا ہے۔ اب اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ نعوذ باللہ یہ ایک بزدلانہ فعل تھا جو انفعالی نفسیات کے تحت اختیار کیا گیا۔

الرسالہ کے مشن کے خلاف آج کل بہت کچھ لکھا اور بولا جا رہا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ تمام لوگ بلا استثنا اسی طریقہ (تشویہ حقائق) کو استعمال کر رہے ہیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی الرسالہ کی بات کو بگاڑ کر پیش کرنا اور اس خود ساختہ بات کو الرسالہ کی بات قرار دے کر اس کی تنقید و تنقیص کرنا۔ مزید حیرت یہ ہے کہ خود ندوہ کے مذکورہ عربی اخبار (الرائد) نے بھی اسی آزمودہ طریقہ کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ہمارے خلاف استعمال کیا ہے، اور اس کا یہ استعمال عین اسی شمارہ میں ہے جس میں اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کو تشویہ حقائق کا مجرم قرار دے کر شدت کے ساتھ ان کو نشانہ ملامت بنایا تھا۔

الرائد کے مذکورہ شمارہ میں آخری صفحہ پر "اخبار و تعلیقات" کے تحت ایک مضمون درج ہے۔ اس میں راقم الحروف (وحید الدین خاں) کے ایک مطبوعہ مقالہ (ٹائمس آف انڈیا ۵ استمبر ۱۹۸۷) کا حوالہ دیتے ہوئے میرے بارہ میں ایک "خبر" کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ "انھوں نے اس میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ کی نسبت سے شکایت اور ناگواری کا طریقہ چھوڑ دیں اور اپنے مطالبات سے دستبردار ہوجائیں اور حالات کی تبدیلی کا اعتراف کریں اور شکست کو قبول کریں اور حقیقتِ حال کا سامنا کریں اور اپنے سیاسی موقف سے ہٹ جائیں اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ جائیں اور نئے حالات کی روشنی میں نئے دور کا آغاز کریں"۔ الرائد کے اصل الفاظ یہ ہیں :

نصح فيه المسلمين بان يتركوا طريق الشكوى، والكراهية بالنسبة للاغلبية ويتنازلوا عن مطالبهم ويعترفوا بتغير الوضع ، ويتقبلوا الهزيمة ، ويواجهوا حقائق الوضع ، وينسحبوا من موقفهم السياسى ، ويقعدوا فى المقاعد الخلفية ويبدؤ عهداً جديداً فى ضوء الظروف الجديدة۔

الرائد کی مذکورہ عبارت تشویہ حقائق کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ اس کو پڑھ کر ایک آدمی سمجھے گا کہ راقم الحروف نے مسلمانوں سے یہ کہا ہے کہ وہ نئے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیں اور اکثریتی فرقہ کے مقابلہ میں ہزیمت اور پسپائی کی حیثیت کو قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔ حالاں کہ ٹائمس آف انڈیا (۵ استمبر ۱۹۸۷) کے مفصل مقالہ کو پڑھ کر کوئی بھی شخص سمجھ سکتا ہے کہ میں نے جو بات کہی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے تدبیری حکمت کی بات کہی ہے نہ کہ کسی قسم کی انہزامی پوزیشن اختیار کرنے کی۔

الرائد کی مطبوعہ "خبر" سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک کفاح اور مطالبۂ حقوق کا راستہ۔ دوسرا، استلام اور انہزام کا راستہ۔ اس کے مطابق میرا کہنا یہ ہے کہ مسلمان کفاح اور مطالبہ کا راستہ چھوڑ کر استلام اور انہزام کا راستہ اختیار کریں۔ یہی ان کے لیے موجودہ حالات کا تقاضا ہے۔ الرائد کی یہ بات یقینی طور پر تشویہ حقائق ہے نہ کہ اصل واقعہ کی ترجمانی۔

ٹائمس آف انڈیا کے زیر بحث مضمون میں جو بات کہی گئی، وہ اس کے برعکس یہ تھی کہ مسلمان

اس ملک میں دو چیزوں کے درمیان ہیں۔ ایک پیش آمدہ مسائل، اور دوسرے امکانی مواقع۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جو لوگ حال کے مسائل میں الجھتے ہیں۔ وہ مواقع کو استعمال کرکے اپنے مستقبل کی تعمیر نہیں کر پاتے۔ اس ملک کے مسلمان پچھلے چالیس سال سے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، اس لیے وہ مستقبل کی طرف ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔

اب مسلمانوں کے لیے بہترین راہ یہ ہے کہ وہ مسائل کے بارہ میں "صبر" کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کریں تاکہ ان کا کل ان کے آج سے بہتر ہو سکے۔ اس مشورہ کو انگریزی میں ان الفاظ میں درج کیا گیا تھا:

Starve the problems, feed the opportunities.

ہندستان کے مسلمان اپنے لیڈروں کی رہنمائی میں احتجاجی طریقہ پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں میں تعمیری طریقہ اختیار کرنے کا داعی ہوں۔ یہی بات مذکورہ مضمون میں بھی کہی گئی ہے۔ مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق، یہ بات میں نے پہلی بار انجمن تعلیمات دین کے ایک جلسہ میں پیش کی تھی جو ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۰ کو گونڈہ میں ہوا تھا اور جس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور قاضی عدیل عباسی وغیرہ شریک تھے۔ ۶۶-۱۹۶۵ کے دوران میں نے یہی بات ندائے ملّت (لکھنؤ) کے صفحات میں پیش کی۔ ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک میں اس کو الجمعیۃ ویکلی (دہلی) میں پیش کرتا رہا اب ۱۹۷۶ سے یہی بات ماہنامہ الرسالہ کے صفحات میں پیش کر رہا ہوں۔

ٹائمس آف انڈیا کے مذکورہ مقالہ میں بھی میں نے یہی بات کہی ہے۔ یہ موجودہ حالات کے اعتبار سے عین اسلامی بات ہے۔ اور یہ وہی بات ہے جس کا ایک اعلیٰ نمونہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صلح حدیبیہ کی صورت میں ملتا ہے۔ مقالہ کا حسب ذیل پیراگراف میرے نقطۂ نظر کا خلاصہ ہے:

In this world (of competition) it is only those who stop railing against defeat and accept it with a view to doing something positive about the situation who can ultimately succeed. We should never lose sight of the fact that a strategic retreat makes it possible to return to the fray. Such tactics were very well understood by the Muslims 1,400 years ago when they drew up the peace treaty of Hudaibiya which, although apparently over-conciliatory towards the opponent, ultimately permitted the Islamic mission to go forward unhindered.

یعنی یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے ۔ یہاں جو لوگ شکست کے خلاف شکوہ شکایت چھوڑ دیں اور حالات کے بارہ میں کچھ مثبت کام کرنے کی خاطر اس کو مان لیں، وہی آخر کار کامیاب ہوتے ہیں ۔ ہمیں کبھی اس حقیقت کو بھولنا نہیں چاہیے کہ تدبیری طور پر پیچھے ہٹنا، دوبارہ میدان مقابلہ میں آنے کو ممکن بناتا ہے ۔ اس حکمت عملی کو چودہ سو سال پہلے مسلمانوں نے بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا جب کہ انھوں نے حدیبیہ کے صلح نامہ کو تیار کیا تھا۔ یہ صلح اگرچہ بظاہر دشمن سے بہت زیادہ جھک کر کی گئی تھی۔ مگر آخر کار اس نے اسلامی مشن کو یہ موقع دیا کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتا چلا جائے ۔

ٹائمس آف انڈیا کے مذکورہ مضمون میں ایک ذیلی سرخی ان الفاظ میں قائم کی گئی تھی :

Strategic Retreat

یعنی تدبیری واپسی ۔ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن (الانفال ۱۶) میں کہی گئی ہے۔ مگر الرّائد نے تشویہ حقائق کے اصول کے تحت یہ کیا کہ اس نے صرف لفظ Retreat کو لے لیا اور دوسرے لفظ Strategic کو حذف کر دیا۔ یعنی جو چیز "تدبیری واپسی" کے طور پر کہی گئی تھی اس کو صرف "واپسی" بنا کر پیش کر دیا۔

یہ وہی طریقہ ہے جس کے ذریعہ کسی نے قرآن سے یہ حکم نکال لیا تھا کہ "نماز کے قریب نہ جاؤ" اور اس عجیب وغریب قرآنی تعلیم کا ماخذ یہ تھا کہ اس نے قرآن کی ایک آیت کو ادھوری شکل میں پیش کیا۔ قرآن میں کہا گیا تھا کہ : لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی ۔ (النساء ۴۳) اس نے سادہ طور پر یہ کیا کہ آیت کے آخری لفظ کو حذف کر دیا اور کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ لاتقربوا الصّلٰوۃ۔ اگر یہ کوئی طریق استدلال ہے تو اس طرح ہر بات ثابت کی جا سکتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ الٹی بات کیوں نہ ہو ۔

امر المسلمین

ہندستان کے مسلم رہنما جس چیز کو مسلمانوں کے ملی مسائل کہتے ہیں، وہ درحقیقت مسلمانوں کے قومی مسائل ہیں۔ یہ مسلمانوں کے اپنے قومی حقوق اور مادی مفادات کا جھگڑا ہے جو انھوں نے اس ملک کی حکومت اور یہاں کے اکثریتی فرقہ کے خلاف بے معنی طور پر چھیڑ رکھا ہے۔ اس قومی عمل کو اسلامی عمل ثابت کرنے کے لیے ان کے رہنماؤوں نے ایک حدیث دریافت کر لی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے: من لم یہتمّ بامر المسلمین فلیس منہم (جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کے لیے فکرمند نہ ہو وہ ان میں سے نہیں)

ہمارے رہنماؤں نے اس حدیث سے "امر المسلمین" کا لفظ لیا اور اس کو موجودہ مسلمانوں کے تمام قومی جھگڑوں پر منطبق کر دیا۔ مگر استدلال کا یہ طریقہ لغویت کی حد تک غلط ہے۔ امر المسلمین سے کون سا "امر" مراد ہے، اس کا تعین قرآن وسنت سے ہوگا، نہ کہ موجودہ مسلمانوں کے اپنے قومی رواجوں سے۔

اس حدیث میں امر المسلمین کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان نامی گروہ جس چیز کو بھی اپنا امر (معاملہ) سمجھ لے، وہ مسلمانوں کا امر بن جائے گا، اور اس کے لیے فکرمند ہونا اور اس کے لیے تدبیر کرنا ضروری ہو جائے گا۔ امر المسلمین وہ ہے جو خدا و رسول کے نزدیک امر المسلمین ہو نہ کہ خود مسلمانوں کے نزدیک امر المسلمین۔

مکہ کے مسلمانوں پر ہر قسم کا ظلم کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے چاہا کہ اپنی مظلومیت کو ختم کرنے کے ظالموں سے جنگ کریں، مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو امر المسلمین نہیں مانا اور ان کو یکطرفہ طور پر صبر کرنے کا حکم دیا۔ حدیبیہ کے معاہدہ کی دفعات صحابہ کرام کو "ملی غیرت" کے خلاف معلوم ہوئیں۔ انھوں نے چاہا کہ اسے رد کر دیں اور قریش سے لڑیں۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو امر المسلمین تسلیم نہیں کیا اور لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اس معاہدہ کو قبول کریں۔ فتح مکہ کے بعد مہاجرین نے چاہا کہ مکہ میں اپنے چھوڑے ہوئے مکانوں پر دوبارہ قبضہ کریں۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی امر المسلمین کی حیثیت نہ دی اور مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ اپنے

مقبوضہ مکانوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر مدینہ واپس چلے جائیں۔ وغیرہ ، وغیرہ

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ کسی امر کا امر المسلمین ہونا خدا و رسول کی مرضی سے طے ہوگا نہ کہ خود مسلمانوں کی اپنی خواہشات یا اپنی رایوں سے۔

مسلمانوں کے ساتھ پہلے بھی معاملات پیش آئے ہیں اور آئندہ بھی پیش آئیں گے۔ مگر ان معاملات کے مقابلہ میں مسلمانوں کی روش کیا ہو، اس کا فیصلہ مسلمانوں کی اپنی مرضی سے نہیں ہوگا۔ بلکہ کتاب وسنت کے بے لاگ مطالعہ سے یہ معلوم کیا جائے گا کہ کس معاملہ میں کون سی روش اختیار کی جائے۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت دو قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ ایک، ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جھگڑے۔ دوسرا، مسلمانوں کے باہمی اختلافات۔ ان دونوں معاملات میں قرآن وسنت کی واضح رہنمائی موجود ہے۔ مسلم رہنما اگر ان معاملات میں مذکورہ حدیث پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو ان کو وہی کام کرنا چاہیے جس کا حکم قرآن وحدیث میں دیا گیا ہے۔

"ہندو مسئلہ" کے متعلق بنیادی بات یہ ہے کہ ہندو ہمارے لیے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ مدعو ہوں، ان کے بارہ میں حکم ہے کہ ان سے نہ مادی اجر طلب کرو اور نہ ان سے قومی نزاع برپا کرو۔ حتی کہ داعی کے اوپر فرض ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں سے یک طرفہ طور پر اعراض کرے۔ مگر ہندستانی مسلمان اس کے سراسر خلاف عمل کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں اہتمام بامر المسلمین یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ روش کی مذمت کی جائے اور ان کو صبر اور اعراض کی روش پر قائم رہنے کی تاکید کی جائے۔

اس کے برعکس اگر مسلم رہنما یہ کریں کہ وہ "ملی مسائل" کے نام پر مسلمانوں کی قومی لڑائی میں شریک ہو جائیں۔ وہ اپنی تقریروں اور اپنے بیانات سے ان کی تصدیق اور ہمت افزائی کرنے لگیں تو یہ واضح طور پر حدیث کے مذکورہ حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔

مسلم رہنماؤں پر فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو بتائیں کہ ہندو ان کے لیے مدعو گروہ کے حکم میں ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ ہندوؤں سے قومی اور مادی مسائل پر ہرگز کوئی نزاع نہ چھیڑیں۔ وہ حقوق طلبی کے بجائے محنت کشی پر اعتماد کریں۔ وہ یک طرفہ قربانی کے ذریعہ مسلم اور ہندو کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنائیں تاکہ اس ملک میں دعوتی عمل کا آغاز کیا جاسکے جو مسلمانوں کی مجرمانہ غفلت کے نتیجہ میں صدیوں

سے رکا ہوا پڑا ہے ۔

"امر المسلمین" کا دوسرا پہلو وہ ہے جو مسلمانوں کے باہمی معاملات سے تعلق رکھتا ہے ۔ موجودہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف اپنے آخری درجہ پر پہنچا ہوا ہے ۔ ہر شہر، ہر محلہ، ہر ادارہ میں اس کے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں ۔ یہاں مسلم رہنماؤں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات اور نزاعات میں براہِ راست دخل دیں اور ہر ممکن تدبیر استعمال کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کریں ۔

اس کوشش کا مطلب جلسہ اور تقریر نہیں ہے ۔ مسلمانوں کے باہمی نزاعات جلسوں اور تقریروں سے ختم نہیں کیے جا سکتے ۔ اس کی شکل صرف ایک ہے ۔ اور وہ اسلام کے اصولِ عدل کے مطابق عملی مداخلت ہے ۔ مثلاً انھیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مقام پر ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کے ساتھ غصب اور خیانت کا معاملہ کیا ہے ۔ اب تمام مسلم لیڈر وہاں پہونچ کر اس غاصب اور خائن کو پکڑیں ۔ اس پر ہر قسم کا قولی اور عملی دباؤ ڈال کر اس کو مجبور کریں کہ وہ اپنے غصب اور خیانت سے باز آئے اور حق کو اس کے حق دار کے حوالے کرے ۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم کا حوالہ دیتے ہیں، مگر وہ مذکورہ بالا دونوں کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کرتے ۔ اس کے برعکس وہ اپنی جھوٹی تقریروں اور سطحی بیانات کے ذریعہ مسلمانوں کی لایعنی قومی مہم میں شریک ہیں ۔ یہ صورت حال مذکورہ حدیث کے سراسر خلاف ہے ۔ مسلم رہنماؤں نے اگر اپنی موجودہ روش نہ بدلی تو شدید اندیشہ ہے کہ ان کا موجودہ عمل سرکشی اور فساد انگیزی کے خانہ میں لکھا جائے نہ کہ خدا و رسول کے حکم کی بجا آوری کے خانہ میں ۔

ایک آیت

فاستقم کما اُمِرتَ ومن تاب معك ولا تطغوا انه بما تعملون بصير ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار ومالکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون (ہود ۱۱۲-۱۱۳)

پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جس نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤگے۔

اس آیت میں جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے وہ بے آمیز دعوت پر استقامت ہے۔ اور عدم رکون (نہ جھکنے) سے مراد یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہرگز کوئی خارجی اثر قبول نہ کرو۔ ہر حال میں اسی دعوتِ توحید پر قائم رہو جس کی تمہیں تلقین کی گئی ہے۔

انسانی سماج میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ غیر خدا کی پرستش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کبھی خدا کو چھوڑ کر اور کبھی خود خدا کے نام پر۔ اس لیے جب بھی سچی خدا پرستی کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ تمام لوگ بھڑ اٹھتے ہیں جو غیر خدائی بنیاد پر اپنی زندگی کا ڈھانچہ کھڑا کیے ہوئے ہوں۔

یہاں داعی بیک وقت دوسخت ترین آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ مدعو کی اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مکمل طور پر صبر کی روش پر قائم رہے، وہ کسی حال میں صبر و اعراض کی راہ سے نہ ہٹے۔ دوسرے یہ کہ مدعو کے لیے قابلِ قبول بنانے کی خاطر وہ دعوت میں کسی بھی قسم کی لچک نہ دکھائے۔ گویا ایک طرف اصل نکتۂ دعوت پر جماؤ، خواہ اس کے نتیجہ میں مدعو کا ردّعمل شدید سے شدید تر کیوں نہ ہو جائے۔ اور دوسری طرف اپنی داعیانہ تصویر کو برقرار رکھنے کی خاطر مدعو کے ہر ظلم کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا۔

یہاں جس عدمِ رکون کا ذکر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی قومی شناخت کو قائم رکھنے پر پوری طرح جمے رہو۔ ایسا ہرگز مت کرو کہ ٹوپی اور شیروانی اتار کر ہیٹ اور پتلون پہننے لگو۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حکمرانوں کے خلاف اپنی تحریک میں کسی قسم کی مصالحت نہ

دکھاؤ، ان کو تخت سے بے دخل کرنے کے سوا کسی اور بات پر راضی نہ ہو۔ آیت کی ایسی ہر تشریح بالکل لغو ہے۔ قومی عدمِ رکون یا سیاسی عدمِ رکون کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ آیت سراسر آدابِ دعوت سے متعلق ہے۔ یہاں عدمِ رکون سے مراد پیغامِ توحید کے بارہ میں عدمِ رکون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ توحید کے خالص پن (Purity) کو پوری طرح باقی رکھو۔ اس میں کسی بھی قسم کی آمیزش نہ کرو۔ قومی حقوق کا مطالبہ، مادی زیادتیوں کے خلاف احتجاج۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اسلوب دعوت کو بدلنا، عوام کے درمیان مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ان کی دل پسند بولی بولنا۔ دعوت کے اصل نکتہ کے ساتھ ایسی باتوں کو شامل کرنا جس سے لوگوں کی بھیڑ جمع ہوتی ہو۔ یہ سب رکون میں شامل ہے۔ اور ایسی ہر چیز سے کامل پرہیز داعی کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔

دعوت کا کام سراسر ایک مثبت کام ہے۔ مگر اس کی صحیح انجام دہی کے لیے دو منفی شرطیں ہیں۔ ایک عدمِ طغیان، اور دوسرے عدمِ رکون۔ امام حسن بصری نے اس بات کو اس طرح بیان کیا کہ اللہ نے دین کو دو لا (نہیں) کے درمیان رکھا ہے۔ تجاوز نہ کرنا، اور جھکاؤ نہ دکھانا۔ (عن الحسن، جعل اللہ الدین بین لاءین ولا تطغوا ولا ترکنوا، تفسیر النسفی)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کی زندگی میں یہ دونوں چیزیں بہت واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مکہ میں ۱۳ سال تک مدعو قوم آپ اور آپ کے اصحاب کے اوپر ہر قسم کا ظلم کرتی رہی۔ مگر آپ نے ان کے خلاف کسی بھی قسم کا ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ یک طرفہ صبر کی روش پر قائم رہے۔ ان کی زیادتیوں کے باوجود آپ نے نہ کبھی احتجاج کیا اور نہ حقوق طلبی کی مہم چلائی۔

اسی طرح مکہ کے سرداروں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہم آپ کی دشمنی چھوڑ دیں گے، آپ ہماری صرف ایک شرط کو پورا کر دیں۔ وہ یہ کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں۔ یہ تمام بُت دراصل ان کے فوت شدہ بزرگ تھے۔ ان بزرگوں کی تصویر بنا کر وہ ان کو پوجتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تنقیدوں کی زد ان پر پڑتی تھی جس سے ان کی عقیدتمندیوں کو سخت ٹھیس لگتی تھی۔ انھوں نے چاہا کہ ان کی غیر خدائی عقیدتمندیوں پر ضرب نہ لگے تو وہ آپ کو اور آپ کے مشن کو گوارا کر لیں گے۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

یہ دونوں چیزیں انسان کے لیے بے حد سخت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے زیادہ سخت چیز اور کوئی اس دنیا میں نہیں۔

مذکورہ آیت میں جو حکم دیا گیا ہے، اس کی اسی سنگین نوعیت کی بنا پر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت شدید ثابت ہوئی تھی۔ البغوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی آیت نہیں اتری جو آپ پر اس آیت سے زیادہ شدید ہو۔ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ سورہ ہود نے مجھ کو بوڑھا کر دیا (ما نزلت علیٰ عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم آیة هی اشدّ علیه من هذه الآیة ولذلك قال : شَیَّبَتْنِیْ سورة هود)

قومی رجحان

ہر قوم کا ایک قومی رجحان ہوتا ہے۔ اس رجحان کا ساتھ دینے سے قوم کے اندر قیادت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو شخص اس رجحان کے خلاف بولے، وہ قوم کے اندر بے جگہ ہو جاتا ہے۔ اس کو قوم کے اندر نہ مقبولیت حاصل ہوتی اور نہ قیادت۔

اس معاملہ کو وقت کی ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا مسئلہ ہے۔ ہندستان کا قومی رجحان یہ ہے کہ کشمیر ایک حل شدہ معاملہ ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کا قومی رجحان یہ ہے کہ کشمیر ایک غیر حل شدہ اور متنازعہ معاملہ ہے۔ چنانچہ دونوں ملک کے لیڈر جب اس مسئلہ پر بولتے ہیں تو وہ اپنے یہاں کے قومی رجحان کی پوری رعایت کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کے خلاف بولتے ہی وہ ختم ہو جائیں گے۔

اس کی مثال دونوں ملکوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً ہندستان میں آنجہانی راج گوپال اچاری نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ ابھی طے ہونا باقی ہے، اس کے بعد وہ ملک کے اندر بالکل غیر مقبول ہو گیے۔ اسی طرح پاکستان میں خان عبدالغفار خاں کا کہنا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ آخری طور پر طے ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پاکستان میں غیر مقبول ہو کر رہ گیے ــــــ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے جس کو قرآن میں رکون (ھود ۱۱۳) کہا گیا ہے۔

رکون (جھکاؤ) اگر کسی گروہ کی طرف ہو تو اس سے آدمی کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

لیکن جب آدمی گروہی تقاضوں کو نظر انداز کر کے خالص حق کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرتا ہے تو وہ لوگوں کے درمیان اکیلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ رکون کا راستہ سب سے زیادہ آسان راستہ ہے۔ اور عدمِ رکون کا راستہ سب سے زیادہ مشکل راستہ۔

قوم کا رجحان خواہش پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس داعی اصول کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ اب اگر داعی اصول کی بات کہے تو وہ قوم سے کٹ جائے گا، اور اگر وہ قومی رجحان کے مطابق بولے تو حق کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ یہ بے حد نازک امتحان ہے۔ مگر داعی کو لازماً حق بات کہنا چاہیے۔ اگر اس نے "قومی آگ" سے بچنے کی خاطر حق کا اعلان نہیں کیا تو اس کو "خدائی آگ" پکڑ لے گی، اور یقیناً خدا کی آگ، قوم کی آگ سے زیادہ سخت ہے۔

اسلام کا طریقہ

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو اپنے قول وعمل کی آزادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک اور دوسرے کے درمیان مقابلہ اور ٹکراؤ پیش آتا ہے جو بعض اوقات عداوت تک پہونچ جاتا ہے (البقرہ ۳۶) ایسی حالت میں کرنے کا کام کیا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں پہلا حفاظتی انتظام وہ ہے جو خود خالق نے پیشگی طور پر کر رکھا ہے۔ اس نے ایسے داخلی اسباب پیدا کر دیئے ہیں کہ لوگوں کی عداوتی نفسیات عام حالت میں سوئی ہوئی رہتی ہے۔ انسان کی بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ سوئے ہوئے کو سویا ہوا رہنے دے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ فتنہ سویا ہوا ہے، اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو اس کو جگائے (ان الفتنة نائمة لعن الله من ايقظها)

۲۔ تاہم احتیاط کے باوجود اگر فتنہ جاگ اٹھے تو اس وقت اس کو دوبارہ ختم کرنے کی اولین کارگر تدبیر یہ ہے کہ آدمی جوابی اشتعال میں مبتلا نہ ہو۔ وہ اس کے معاملہ میں خاموشی اور اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اکثر حالات میں صرف خاموشی اور اعراض اس کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق کی یہ نصیحت نہایت بامعنی ہے کہ باطل کو ہلاک کرو اس کے بارہ میں چپ رہ کر (اميتوا الباطل بالصمت عنه)

۳۔ اگر بالفرض جاگی ہوئی عداوت صرف خاموشی اور اعراض سے ختم نہ ہو تو اس کے بعد دوسری موثر تدبیر قرآن میں یہ بتائی گئی کہ برائی کے جواب میں بھلائی کا انداز اختیار کیا جائے۔ اخلاق کی اس قسم میں تسخیر کی طاقت ہے، وہ دشمن کو بھی دوست بنا دیتا ہے (حم السجدہ ۳۴)

۴۔ بعض استثنائی واقعات میں ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ فطری تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو۔ اس وقت مظاہرۂ طاقت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ طاقت کا استعمال اب بھی نہ کیا جائے۔ صرف یہ کیا جائے کہ طاقت کے مظاہرہ سے فریق ثانی کو اتنا مرعوب کیا جائے کہ وہ مخالفانہ اقدام سے رک جائے (الانفال ۶۰)

۵۔ اگر سنجیدہ کوشش کے باوجود یہ تمام تدبیریں ناکام ہوجائیں اور فریق ثانی سے مقابلہ بالکل ناگزیر ہوجائے تو اس وقت اپنے دفاع میں حسب استطاعت مقابلہ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اصلاحی کام

۲۸ اگست ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ تین صاحبان ملاقات کے لیے ہمارے دفتر (نئی دہلی) میں آئے۔ یہ تینوں بہار (مظفر پور) سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

محمد مطیع الرحمٰن چترویدی (۴۰ سال) محمد ابراہیم (۵۰ سال) محمد داؤد (۴۰ سال)

یہ لوگ "تبلیغی تحریک" کے انداز پر "اصلاحی تحریک" چلا رہے ہیں۔ وہ یکم اگست کو اپنے وطن سے نکلے۔ بہار اور یوپی کے مختلف شہروں اور قصبوں سے گزرتے ہوئے وہ دہلی پہونچے۔ ایک ماہ کے دوران وہ تقریباً سو بستیوں میں گیے اور لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔

مظفر پور سے مذکورہ تین آدمی چلے تھے۔ اس کے بعد اور آدمی ان سے ملتے گیے۔ یہاں تک کہ ان کا قافلہ ۳۵ آدمیوں پر مشتمل ہو گیا۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنا برتن اور سامان خوراک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مسجدوں میں قیام کرتے ہیں۔ ہر آدمی اپنا خرچ خود ادا کرتا ہے۔ جہاں پہونچتے ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ اور پھر ان کے معاملات میں عملی مداخلت کر کے انھیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس ایک مہینہ کے سفر میں انھوں نے بہت سے اصلاحی کام کیے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ بیوہ خاتون کا نکاح کرایا۔ ایک جگہ لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ جہیز وغیرہ کے بغیر شادی کریں۔ چنانچہ کئی لوگ تیار ہوئے اور بالکل سادہ طور پر ان کی شادیاں کرائیں۔ لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ کم مہر مقرر کریں اور مہر معجل کے اصول پر اس کو بوقت نکاح ادا کر دیں۔ کہیں دو مسلمانوں میں جھگڑا قائم تھا۔ اس کو ختم کرا کر دونوں کے درمیان صلح کرائی۔ ایک جگہ مسجد کی تقسیم کر کے دو جماعتیں جاری ہو گئی تھیں۔ وہاں تقسیم کو ختم کرایا اور ایک جماعت جاری کرائی۔ وغیرہ وغیرہ

یہ بلاشبہ عین اسلامی کام ہے۔ جس طرح تبلیغی جماعت "کلمہ و نماز" کے میدان میں کام کر رہی ہے، اسی طرح مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کے لیے وسیع پیمانہ پر تحریک چلائی جائے۔ اس کا انداز کار وہی ہو جو تبلیغی جماعت کا انداز کار ہے۔ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اسی طرح کی عملی کوششوں سے ہوگی نہ کہ تقریروں اور جلسوں کی دھوم مچانے سے۔

حکیمانہ تدبیر

دنیا مقابلہ کا میدان ہے۔ یہ مقابلہ اول دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہے گا۔ مقابلہ کا یہ نظام خود خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ اس لئے کوئی شخص یا قوم اس کو بدلنے پر قادر نہیں، خواہ وہ اس کے خلاف کتنا ہی زیادہ فریاد اور احتجاج کرے۔

مقابلہ کی اس دنیا میں کوئی شخص صرف حکیمانہ تدبیر سے کامیاب ہوسکتا ہے۔ حکیمانہ تدبیر سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اور دوسرے کے معاملہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھے اور ایسے حالات پیدا کرے جس میں فیصلہ کا سرا اس کے اپنے ہاتھ میں آجائے۔ اس بات کو ایک لطیفہ سے بخوبی طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک سارس اور ایک لومڑی میں دوستی تھی۔ ایک بار لومڑی نے سارس سے کہا کہ آؤ ہم دونوں مل کر کھیر پکائیں۔ کچھ سامان تم لاؤ اور کچھ سامان میں لاؤں۔ اس طرح کھیر تیار کی جائے اور پھر دونوں مل کر اسے کھائیں۔ چنانچہ دونوں سامان لے آئے اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔

جب کھیر کو نکال کر برتن میں رکھنے کا وقت آیا تو لومڑی فوراً ایک تھال لے آئی۔ اس نے کہا کہ کھیر اس میں رکھی جائے گی۔ کھیر کو تھال میں رکھ کر لومڑی نے کھانا شروع کر دیا اور سارس سے کہا کہ آؤ تم بھی کھاؤ۔ تھال جیسے برتن میں کھانا لومڑی کے لئے آسان تھا۔ چنانچہ لومڑی ساری کھیر کھا گئی۔ سارس اپنی لمبی چونچ پھیلے ہوئے تھال میں ادھر ادھر مارتا رہا مگر وہ کھیر کی بہت کم مقدار حاصل کرسکا۔

سارس نے اپنے دل میں کہا کہ لومڑی نے تو اس طرح مجھے بیوقوف بنا دیا۔ آخر کار اس نے سوچ کر ایک تدبیر نکالی۔ اس نے لومڑی سے کہا کہ آؤ ایک بار اور ہم دونوں مل کر کھیر پکائیں۔ دوبارہ دونوں سامان لے آئے۔ اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔ اب سارس نے پیشگی منصوبہ کے مطابق فوراً ایک صراحی لا کر رکھ دی۔ اور کہا کہ کھیر اس میں رکھی جائے گی۔ چنانچہ کھیر نکال کر صراحی میں رکھ دی گئی۔ سارس نے فوراً صراحی کے منھ میں اپنی لمبی چونچ ڈال کر کھیر کو کھانا شروع کر دیا اور لومڑی سے کہا کہ تم بھی کھاؤ۔ مگر اب صورت حال سارس کے حق میں تھی۔ سارس نے خوب سیر ہو کر کھیر کھائی اور لومڑی بھوکی رہ گئی۔

انسانیت کی پوری تاریخ میں سارس اور لومڑی کی یہی کہانی دہرائی جارہی ہے۔ جو لوگ کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں وہ اس میں سے حصہ پاتے ہیں، اور جو لوگ کھیر کو اپنے موافق برتن میں نہیں رکھ پاتے وہ اس سے محروم رہتے ہیں۔

اس تدبیر کی ایک شاندار مثال صلح حدیبیہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد آپ کے مخالفین (قریش) یہ چاہتے تھے کہ وہ آپ کے اور آپ کے معاملہ کو جنگ کے میدان میں طے کریں۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جنگ کے میدان میں وہ زیادہ موافق پوزیشن میں ہیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ معاملہ کو امن کے ماحول میں لے آئیں۔ کیوں کہ امن کے ماحول میں نظریہ فیصلہ کن بنتا، اور نظریہ کے اعتبار سے شرک کے مقابلہ میں توحید کو واضح طور پر زیادہ برتر پوزیشن حاصل تھی۔ صلح حدیبیہ نے اسلام کو یہی موافق میدان فراہم کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد دو سال سے بھی کم عرصہ میں مکہ فتح ہوگیا۔

اب ہندستان کے مخصوص حالات کے اعتبار سے اس معاملہ پر غور کیجئے۔ ہندستان میں مسلمانوں کا مقابلہ ہندو فرقہ سے ہے۔ مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ہندو ان کے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اور فرقہ وارانہ جھگڑوں میں انھیں سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ نقصان کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ مگر یہ نقصان خود مسلمانوں کے سطحی قائدین کی نادانی کی بنا پر پیش آرہا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی کم فہمی کی بنا پر مذکورہ تدبیر کو مسلمانوں کے حق میں استعمال نہ کرسکے۔

ہندو قوم اس وقت تین بڑے طبقوں پر مشتمل ہے۔ ایک تعلیم یافتہ طبقہ جو ملک کے اکثر انتظامی اور سماجی عہدوں پر قابض ہے۔ دوسرا تاجر طبقہ جو ملک کی بیشتر اقتصادیات پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ تیسرا گروہ ہندو عوام اور پس ماندہ طبقات کا ہے۔ جو تعداد کے اعتبار سے ہندو قوم کا زیادہ بڑا حصہ ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ اپنے تعلیمی مزاج کی بنا پر سیکولر یا سائنٹفک ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ وہ معاملات پر فرقہ وارانہ انداز کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں رائے قائم کرتا ہے۔ تاجر طبقہ کے سامنے اصلاً اس کا تجارتی مفاد ہے۔ چوں کہ تجارت کی مشین کو جاری رکھنے کے لئے امن ضروری ہے، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ملک میں امن کا ماحول قائم رہے۔ تاکہ اس کے تجارتی عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

تیسرا طبقہ زیادہ تر غریب اور بے روزگار یا کم آمدنی والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہی طبقہ اصلاً تمام فسادیں ملوث ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ دنگے اور فساد میں ہے۔ کیوں کہ فساد میں اس کو لوٹنے کا موقع ملتا ہے۔ پر امن حالات میں لوٹنے والا فوراً فوجداری قانون کی زد میں آجاتا ہے۔ مگر فساد کے موقع پر جو لوگ لوٹ مار کرتے ہیں ان کو یہ اطمینان حاصل رہتا ہے کہ ملک کے موجودہ نظام میں ان کی کوئی قانونی پکڑ ہونے والی نہیں۔

ہندو قوم کے ان تین طبقات کو آسانی کی خاطر دو گروہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ پہلے اور دوسرے طبقہ کا۔ یہ پہلا گروہ اپنے مزاج یا اپنے مفاد کے تحت فساد اور بدنظمی کو نہیں چاہتا۔ البتہ ان کے علاوہ ہندوؤں کا جو عوامی گروہ ہے اس کی ایک تعداد فساد میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اسی گروہ کے افراد فرقہ پرست تنظیموں میں شامل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ جلوس نکالتے ہیں اور مسلم مخالف نعرے بلند کرتے ہیں۔ یہی لوگ مختلف طریقوں سے ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جن سے مسلمان مشتعل ہو کر تشدد کریں۔ تاکہ انھیں مسلم بستیوں میں لوٹ مار کا موقع مل سکے۔

اب مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ ملک میں جب بھی فرقہ وارانہ مسئلہ یا کشیدگی کی صورت پیدا ہو تو وہ "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کی کوشش کریں۔ یعنی وہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اس کی کوشش کریں کہ مسئلہ کو طے کرنے کے لئے اس کو پہلے گروہ (ہندو خواص) کی سطح پر لایا جائے۔ وہ دوسرے گروہ (ہندو عوام) کی سطح پر نہ جانے پائے۔ پہلے گروہ کی سطح پر معاملہ کا فیصلہ کیا جائے تو یہ فیصلہ ہمیشہ مسلمانوں کے موافق ہوگا۔ اور اگر وہ دوسرے گروہ کی سطح پر چلا گیا تو شدید اندیشہ ہے کہ فیصلہ ان کے خلاف ہو جائے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک واقعاتی مثال لیجئے۔ یہ مثال موافق برتن اور مخالف برتن کے نظریہ کو بہت اچھی طرح واضح کر رہی ہے۔

ایک واقعہ

مدراس میں ۷۰ ویلیج روڈ پر ایک مسجد بنائی گئی ہے۔ یہ مسجد مسلم ویلفیر اسوسی ایشن کے زیر انتظام ہے۔ اس مسجد پر اذان کے لیے لاوڈ اسپیکر لگایا گیا تو علاقہ کے کچھ ہندوؤں کو اس پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے پولیس سے شکایت کی کہ لاوڈ اسپیکر پر اذان سے ہمارے گھروں اور ہمارے مندروں کے سکون

میں خلل واقع ہوتا ہے ، اس لیے مسلمانوں کو لاوڈ اسپیکر پر اذان دینے سے روکا جائے ۔ مگر مدراس پولیس نے اس شکایت پر کوئی کارروائی نہیں کی ۔

اس کے بعد ایک مقامی ہندو نے مدراس ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن داخل کیا ۔ اور عدالت سے درخواست کی کہ لاوڈ اسپیکر کی اذان مقامی ہندوؤں کے لیے تکلیف کا باعث ہے ، اس لیے اس کو بند کرنے کا حکم جاری کیا جائے ۔

جسٹس بکھتاوت سولم نے دونوں فریقوں کے بیانات سننے کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ کو اپنا فیصلہ سنایا ۔ انھوں نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں عدالت کو مداخلت کرنی چاہیے ۔ مدعی کے دلائل میری نظر میں تشفی بخش نہیں ہیں ۔ ایک جمہوری ملک میں ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرے ۔ اس طرح کے معاملات میں ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر تحمل اور رواداری (Tolerance) ہو ، خاص طور پر ہندستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب پر عمل کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں ۔ اس بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ مدعی کی درخواست قابل لحاظ ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ مسجد میں لاوڈ اسپیکر کا استعمال عین قانون کے مطابق ہے ۔ اس اظہار خیال کے ساتھ مدعی کی درخواست خارج کی جاتی ہے :

With these observations, the writ petition will stand dismissed.

مدراس ہائی کورٹ کا فیصلہ مکمل اور اصلی صورت میں الرسالہ انگریزی (دسمبر ۱۹۸۹) میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ یہ فیصلہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں اگر کچھ لوگ متعصب اور فرقہ پرست ہیں تو یہاں ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو بے تعصب اور انصاف پسند ہیں ۔ مزید یہ کہ یہ دوسرے لوگ اس حد تک طاقت ور ہیں کہ وہ پہلے گروہ کے ارادے کو عمل میں آنے سے روک دیں ۔

اب اس واقعہ پر ایک اور انداز سے غور کیجیے ۔ فرض کیجیے کہ مدراس کی مذکورہ مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر جب ہندوؤں نے اعتراض کیا تو وہاں کے مسلمان بگڑ جاتے ۔ وہ اس کے مقابلہ میں جلسہ اور ایجی ٹیشن کی سیاست چلاتے ۔ وہ ہندوؤں سے ٹکراؤ کرتے ، تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ۔ ہندوؤں کی ضد بڑھتی ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ لڑائی چھڑ جاتی ۔ اب وہی واقعات پیش آتے جو شمالی ہند میں اسی قسم کے مسائل پر پیش آتے رہتے ہیں ۔ یعنی دونوں

فرقوں کے درمیان فساد ، اور پھر مسلمانوں کا یک طرفہ طور پر مارا جانا۔ اور ان سب کے باوجود اصل مسئلہ کا اپنی جگہ بدستور باقی رہنا۔

ہائی کورٹ کے جج امکانی طور پر منتظر تھے کہ مسلمان ان کی عدالت میں اپنے مقدمہ کی پیروی کریں اور وہ عین مسلمانوں کے حق میں قانونی فیصلہ دے دیں۔ مگر مسلمانوں کی غیر حکیمانہ روش کے نتیجہ میں یہ ہوتا کہ تمام جج گویا انتظار میں پڑے رہتے اور مسلمان غیر ضروری طور پر مارے جاتے۔ ان کی جائدادیں جلائی جاتیں۔ لاؤڈ اسپیکر کو بچانے کے نام پر پوری مسجد ویران کر دی جاتی۔ یہ امکان اپنی پوری موجودگی کے باوجود ، مسلمانوں کے حق میں واقعہ نہ بن سکتا۔ اس دنیا میں کوئی امکان اپنے آپ کسی کے حصہ میں نہیں آتا۔ یہاں ہر امکان کو استعمال کرنا پڑتا ہے ، اس کے بعد ہی وہ کسی کے لئے واقعہ بنتا ہے۔

مدراس کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے کامیابی کا عظیم امکان موجود ہے ، مگر مسلمان اب تک اس امکان کو استعمال نہ کر سکے ، اس لئے ان کے مسائل بھی اب تک حل نہیں ہوئے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے موجودہ رہنماؤں نے مجرمانہ حد تک غفلت کا ثبوت دیا ہے۔

مسجد کے معاملہ کو عدالت کے ذریعہ طے کرنا گویا کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنا تھا۔ اس کے برعکس مسجد کا مسئلہ اگر عوامی مظاہرہ کا موضوع بنایا جاتا تو یہ کھیر کو ایسے برتن میں رکھنا ہوتا جو مسلمانوں کے لئے غیر موافق تھا۔ پہلی صورت میں کھیر پوری طرح مسلمانوں کے حصہ میں آئی۔ جب کہ دوسری صورت میں کھیر تمام تر دوسرے کے حصہ میں چلی جاتی۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ یہ مثال وہ ہے جس کو مسلمانوں کے موجودہ مسائل میں نمبر ایک درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔

بابری مسجد کا مسئلہ

بابری مسجد (اجودھیا) کا مسئلہ اگرچہ ملک کے بٹوارہ کے پہلے سے موجود ہے۔ تاہم اپنی موجودہ صورت میں اس کا آغاز فروری ۱۹۸۶ میں ہوتا ہے جب کہ فیض آباد ڈسٹرکٹ جج کے حکم سے اس کا تالا کھول دیا گیا اور ہندوؤں کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ مسجد کے اندر اپنی مورتیاں رکھ دیں۔

اس کے بعد مسلمانوں (صحیح تر لفظ میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈروں) نے کیا کیا۔ ان کے لئے عین وہی

امکان موجود تھا جس کی ایک مثال مدراس ہائی کورٹ کے فیصلہ کی صورت میں اوپر بتائی گئی ہے۔ مگر مسلم لیڈروں نے اس امکان کو استعمال نہ کرتے ہوئے عین اس کے برعکس عمل کیا۔ مارچ ۱۹۸۶ میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنائی گئی۔ اس نے فوراً ہی ایجی ٹیشن کے انداز میں اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں جلسے کر کے جوشیلی تقریریں کی گئیں اور جلوس کے مظاہرے سڑکوں پر کئے جانے لگے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ مارچ ۱۹۸۷ میں تین لاکھ مسلمانوں کی ریلی دہلی میں نکالی گئی جس میں نعروں اور تقریروں کا ہنگامہ گرم کیا گیا۔ اعلان کیا گیا کہ اگست اور اکتوبر ۱۹۸۸ء میں لاکھوں مسلمان مارچ کرتے ہوئے اجودھیا میں داخل ہوں گے اور بابری مسجد میں گھس کر جمعہ کی نماز پڑھیں گے۔ شور وغل کی اس سیاست سے بابری مسجد تو مسلمانوں کو نہیں ملی۔ البتہ فرقہ پرست ہندو جاگ اٹھے۔ یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، گجرات وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں مسلمان ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔ اربوں روپئے کی جائدادیں برباد کر دی گئیں۔

جس وقت یہ سب کچھ ہو رہا تھا، عین اسی وقت اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک انتہائی شاندار امکان مسلمانوں کے لئے اس ملک میں موجود تھا۔ مگر مسلم لیڈر اپنی ناقابل فہم بے خبری کی بنا پر نہ اس سے آگاہ ہوئے اور نہ اس امکان کو استعمال کرنے کی کوئی سنجیدہ تدبیر کر سکے۔

یہاں میں ایک خصوصی میٹنگ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا تفصیلی تذکرہ الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں چھپ چکا ہے۔ یہ میٹنگ نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو ہوئی۔ اس کا مقصد بابری مسجد (اجودھیا) کے مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذمہ دار حضرات شریک ہوئے۔ مسلمانوں کی طرف سے جن لوگوں نے میٹنگ میں شرکت کی، ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ ہندو سائڈ میں مہنت اویدناتھ (صدر رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی)، آچاریہ منی سوشیل کمار، سنجے ڈالمیا اور دوسرے بہت سے ذمہ دار حضرات شریک تھے۔

جب تمام لوگ بول چکے تو میں نے ایک مختصر تقریر کی۔ ضروری پہلوؤں پر اظہار خیال کے بعد میں نے کہا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے سب سے زیادہ بہتر طریقہ ثالثی کا اصول ہے۔ اگر دونوں فریق ثالثی کے اصول کو مان لیں تو میری تجویز ہے کہ مسئلہ تاریخ دانوں (تاریخ کے پروفیسروں) کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ دونوں طرف کے ذمہ دار لوگ اس بات کا پیشگی عہد کریں کہ تاریخ دانوں کا بورڈ جو فیصلہ

کرے گا، اس کو وہ بلا بحث مان لیں گے اور فوراً اس کی تعمیل کریں گے۔

ہندو سائڈ کے تمام لوگ، بشمول مہنت اویدناتھ (موجودہ ایم پی) نے اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا۔ ہر ایک نے کہا کہ ہم اس تجویز کو مانتے ہیں۔ اس کو باقاعدہ صورت دی جائے اور اس کے مطابق بابری مسجد۔ رام جنم بھومی قضیہ کا فیصلہ کیا جائے۔ مگر مسلم سائڈ نے اس تجویز کو منظور نہیں ہونے دیا۔ سید شہاب الدین صاحب تقریباً چیخنے کے انداز میں بولنے لگے کہ ہم کو یہ تجویز منظور نہیں۔ مسلم سائڈ کے دوسرے تمام افراد نے خاموش رہ کر سید شہاب الدین کی بالواسطہ تائید کی۔ ان خاموش رہنے والوں میں جماعت اسلامی کے نمائندہ جناب افضل حسین صاحب (وفات یکم جنوری ۱۹۹۰) بھی شامل تھے۔ اس طرح ہندو سائڈ کی متفقہ تائید کے باوجود یہ میٹنگ شور وغل پر ختم ہوگئی۔

اب غور کیجئے کہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی اس تجویز کو اگر مسلم رہنماؤں نے مان لیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس کا اندازہ نہایت آسانی سے ان خطوط اور مضامین اور بیانات کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جو اس موضوع پر ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے برابر شائع کئے جاتے رہے ہیں۔ ۸۹ - ۱۹۸۷ کے درمیان اس قسم کی تحریریں کثرت سے شائع ہوئی ہیں جن کو عام مسلمان بھی قومی آواز، تعمیر حیات نقیب، دعوت، نئی دنیا، اخبار نو وغیرہ کی فائلوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہاں میں صرف دو حوالوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ دو حوالے بطور حصر نہیں ہیں بلکہ صرف بطور مثال ہیں۔ انھیں پر دوسروں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ایک بڑا تاریخی ادارہ ہے جس کو سنٹر فار ہسٹاریکل اسٹڈیز کہا جاتا ہے۔ اس ادارہ کے ۲۴ پروفیسروں نے بابری مسجد۔ رام جنم بھومی مسئلہ کا مطالعہ خالص تاریخی انداز میں کیا اور اس پر ایک مفصل دستاویز تیار کی۔ یہ دستاویز ان کی طرف سے مشترکہ طور پر شائع کی گئی۔ اس دستاویز کا خلاصہ ٹائمس آف انڈیا (۶ نومبر ۱۹۸۹) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دستاویز کا اردو ترجمہ قومی آواز (۲ جنوری ۱۹۹۰) میں شائع ہوا ہے۔

اس تاریخی دستاویز پر جن لوگوں کے دستخط ہیں ان میں پروفیسر ایس گوپال، پروفیسر رومیلا تھاپر، پروفیسر بپن چندر جیسے ممتاز مورخین کے نام بھی شامل ہیں۔ اس مشترکہ تاریخی دستاویز میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بابری مسجد تو ایک تاریخی واقعہ ہے، مگر رام جنم بھومی کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں۔ یہ ایک

فرضی کہانی ہے جو زیادہ تر والمیکی کی افسانوی نظم (رامائن) پر مبنی ہے۔ اس کا معلوم تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔

ان تاریخی پروفیسروں کے پیش کئے ہوئے حقائق اتنے قطعی تھے کہ خود ہندوؤں میں بھی کوئی اس کو علمی طور پر رد نہ کرسکا۔ مثلاً مسٹر کے آر ملکانی (ٹائمس آف انڈیا ۵ جنوری ۱۹۹۰) نے بالواسطہ طور پر اقرار کرلیا کہ رام جنم بھومی کا قصہ ابتدائی دور کا افسانہ (primitive myth) کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم یہ مذہبی معاملہ ہے، اس لئے اس کو پیشہ ور تاریخ دانوں کے ذریعہ طے نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے جواب میں ایک نہایت ممتاز دانشور ملک راج آنند (بمبئی) نے نہایت سخت تردیدی خط لکھا جو ٹائمس آف انڈیا (۵ فروری ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔

دوسرا حوالہ جو میں اس سلسلہ میں دینا چاہتا ہوں، وہ ایک واقعہ ہے جو مختلف اخباروں، مثلاً اسٹیٹسمین (۶ جنوری ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ بعض اردو اخباروں میں بھی اس کی روداد آئی ہے، مثلاً نئی دنیا (۲۷ جنوری ۱۹۹۰) اسٹیٹسمین کی رپورٹ کی نقل الگ صفحہ پر شائع کی جارہی ہے۔

ہندستانی مورخوں کی ایک قدیم اور نہایت اہم تنظیم ہے جس کا نام انڈین ہسٹری کانگرس ہے۔ اس کے اجلاس ہر سال ملک کے مختلف حصوں میں ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۹ اس تاریخی انجمن کی گولڈن جوبلی کا سال تھا۔ اس کے تحت ۳۰ دسمبر ۱۹۸۹ - یکم جنوری ۱۹۹۰ کو اس کا اجلاس گورکھپور میں ہوا۔ میزبانی کے فرائض گورکھپور یونیورسٹی نے انجام دئے۔ اس کانگرس میں ملک کے مختلف حصوں سے ۳۰۰۰ سے زیادہ ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ یہ لوگ ملک بھر کی سو سے زیادہ یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۸۶ میں جب بابری مسجد - رام جنم (اجودھیا) کے مسئلہ نے شدت اختیار کی تو اس وقت انڈین ہسٹری کانگرس نے اپنے اجلاس (۱۹۸۶) میں متفقہ طور پر ایک رزولیوشن منظور کیا تھا۔ یہ رزولیوشن انڈین ہسٹری کانگرس کی رپورٹ ۱۹۸۶ (صفحہ ۱۸۷) میں چھپا ہوا موجود ہے۔ اس رزولیوشن میں اجلاس میں شریک ہونے والے تمام تاریخ دانوں نے متفقہ طور پر کہا تھا کہ:

"انڈین ہسٹری کانگرس ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور انتشار پسندی پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ اس رجحان کی ایک تشویشناک مثال کسی فرقہ کی صدیوں پرانی عبادت گاہوں کو اس

Indian History Congress

Walk-out over Ayodhya issue

The communal politics of Ramjanambhoomi-Babri Masjid controversy intruded rudely into the annual Indian History Congress being held at Gorakhpur University, earlier this week, leading to a walk-out by over 300 delegates, including the president of the Congress and leading historians.

On December 30, 1989 the Indian History Congress unanimously adopted a resolution reiterating its stand taken since 1986 that "monuments of ancient and medieval times should be rigorously brought under the protection of Ancient Monuments Act, and no structural change should be allowed, and that wherever religious worship had ceased, it should not be allowed to be re-started, whatever be the religious denomination involved."

Following this the Vice-Chancellor of Gorakhpur University, Professor Ms Pratima Asthana, who was also the local secretary of the Congress received a request from a member of Parliament from Gorakhpur, Mahant Avaidyanath of the Vishwa Hindu Parishad, that he would like the opportunity of addressing the Congress. When this request was put before the delegates, it was resisted and rejected as this was not on the agenda and the Indian History Congress was not the place for a political statement on a contentious issue.

However, Professor Asthana walked into the Congress followed by the Mahant and the majority of delegates including the president of the Congress walked out. Mahant Avaidyanath then addressed a few delegates, some employees of Gorakhpur University and some RSS workers, while the majority of the delegates held a meeting outside. Apparently slogans and counter slogans were raised and after Mahant Avaidyanath left the Congress continued its sessions.

Among those who walked out were Professor Irfan Habib of Aligarh Muslim University, Professor Barun De of the Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta. Professor Durga Prasad Bhattacharya of the Indian Statistical Institute, Calcutta, Proffessor A.Q. Rafeeq of Kashmir, Professor R. Champakalakshmi from Jawaharlal Nehru University and Professor Athar Ali, the President of the Congress.

Delegates expressed the view that even if all the Members of Parliament had done what Mahant Avaidyanath had done, the Congress would have reiterated its position. No request had been received from anyone to address the Congress while the agenda was being prepared for the annual Congress was a purely academic conference.

Historians resent the fact that an attempt was made by the Vishwa Hindu Parishad to use its forum for presenting a communal point of view and to create a disturbance at the Congress.

The Congress has nominated Professor H.L. Gupta, retired professor from Sagar University, as President of its next annual session.

The Statesman, New Delhi, January 6, 1990

بنیاد پر دوسرے فرقوں کی عبادت گاہوں میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے کہ ان کو ان مقامات پر تعمیر کیا گیا تھا جہاں پہلے آخر الذکر فرقہ کی عبادت گاہیں تھیں۔ انڈین ہسٹری کانگرس کا خیال ہے کہ ماضی کی تخریبی کارروائیوں کی داستانوں کو دہرانا تاریخ کے نام کو ناپاک مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ اس تحریک کے رہنما جو شہادتیں پیش کرتے ہیں وہ اکثر مشکوک ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک آزاد ہندستان کی سیکولر اقدار کے منافی ہے۔ ہسٹری کانگرس تمام لوگوں سے، بالخصوص مورخوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سائنس اور سیکولرزم پر اس حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔" (خلاصہ)

گورکھپور کے اجلاس میں ۳۰ دسمبر ۱۹۸۹ کو اس سابقہ رزولیوشن کی نقلیں تمام شرکا ء کے درمیان تقسیم کی گئیں تاکہ موجودہ اجلاس میں دوبارہ اس کی توثیق کرائی جائے۔ اس کی خبر مہنت اویدناتھ کو ہوئی۔ وہ رام جنم بھومی تحریک کے لیڈر ہیں۔ انھوں نے گورکھپور سے وشو ہندو پریشد کے ٹکٹ پر لوک سبھا کے چناؤ (۲۲ نومبر ۱۹۸۹) میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔

مہنت اویدناتھ (ایم پی) کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی کی خاتون وائس چانسلر پرتیما استھانا کے پاس درخواست بھیجی کہ ان کو ہسٹری کانگرس کے اجلاس میں تقریر کرنے کی اجازت دی جائے۔ ہسٹری کانگریس کے مندوبین اس کے حق میں نہیں تھے۔ تاہم وائس چانسلر نے انھیں اجازت دے دی۔ مہنت اویدناتھ آر ایس ایس کے کچھ نوجوانوں کے ساتھ اجلاس میں آگئے۔ کانگرس کے مندوبین کو اس پر سخت اعتراض ہوا۔ یہاں تک کہ انھوں نے واک آؤٹ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ تین سو مندوبین میں سے صرف آٹھ آدمی اجلاس میں باقی رہے۔ مہنت اویدناتھ نے ایک ایسے ہال میں تقریر کی جہاں زیادہ تر خالی کرسیاں ان کو سننے کے لئے موجود تھیں۔

واک آؤٹ کرنے کے بعد مندوبین نے ہال کے باہر لان پر اپنی میٹنگ کی۔ اس میں مختلف یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسروں نے تقریریں کیں۔ انھوں نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ ایک ایم پی تو درکنار، پارلیمنٹ کے تمام ممبران بھی ہم کو اس راہ سے نہیں ہٹا سکتے جس کو ہم تاریخی طور پر درست سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مہنت جی کا نام ایجنڈے میں شامل نہیں اس لئے انھیں ہسٹری کانگرس سے خطاب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ انھوں نے اس بات پر سخت غصہ کا اظہار کیا کہ فرقہ پرست

لوگ اپنے پروپیگنڈے کے لئے ہسٹری کانگرس کا پلیٹ فارم استعمال کر رہے ہیں۔ گورکھپور یونیورسٹی کے طالب علموں کی بڑی تعداد نے بھی کھل کر اس کی حمایت کی۔

اس معاملہ نے اتنی شدت اختیار کی کہ بعد کو خود وائس چانسلر پرتیما استھانا نے کھل کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اور اگلے اجلاس میں مندوبین سے معافی مانگی۔

مہنت اوید ناتھ جب خالی کرسیوں کو خطاب کرکے واپس چلے گئے تو مندوبین دوبارہ اسمبلی ہال میں واپس آئے اور ایک بار پھر انھوں نے اتفاق رائے سے وہ رزولیوشن منظور کیا جو دسمبر ۱۹۸۶ میں متفقہ طور پر منظور کیا جا چکا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کانگرس کے آٹھ مندوبین جو واک آؤٹ میں شریک نہیں ہوئے تھے، وہ بھی اس رزولیوشن کی مخالفت کی جرأت نہ کرسکے۔ جب رزولیوشن پر رائے شماری کی گئی تو اجلاس کے ایک شخص نے بھی اس کی مخالفت میں اپنا ووٹ نہیں دیا۔

اوپر کے حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا دانشور اور مورخ طبقہ عام طور پر غیر فرقہ وارانہ انداز میں سوچتا ہے۔ وہ معاملات پر سائنٹفک انداز سے رائے قائم کرتا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھئے تو نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی تجویز کو مسلم لیڈروں نے منظور کرکے اس پر عملدرآمد کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ کس صورت میں نکلتا۔ یہ یقینی طور پر "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کے ہم معنی ہوتا۔ کیوں کہ تاریخ دانوں کا بورڈ اپنے علمی ذہن کی بنا پر تاریخی حقائق کی بنیاد پر فیصلہ کرتا۔ اور جب تاریخی حقائق کی بنیاد فیصلہ کیا جاتا تو وہ عین مسلمانوں کی موافقت میں ہوتا۔

یہاں مسلمانوں کے نادان لیڈروں نے ناقابل معافی ملّی جرم کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ موقع تھا کہ اجودھیا مسئلہ کی "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھوائیں۔ مگر انھوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت اس کو اپنے غیر موافق برتن میں رکھ دیا۔ مورخین سے فیصلہ لینے کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ مسئلہ کو عوامی مظاہروں کا عنوان بنایا۔ وہ سڑکوں پر اس کا فیصلہ کرنے کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ کھیر کو اس برتن میں رکھنے کے ہم معنی تھا جو فریق ثانی کے لئے زیادہ موافق ہو۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ عین وہی تھا جو قانون قدرت کے تحت پیشگی طور پر اس کے لئے مقدر تھا۔ ایک فریق ساری کھیر کھا گیا، اور دوسرا فریق بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا، اور کچھ نہ کرسکا۔

عمل کے نام پر بے عملی

شیخ محمد اکرام (آئی سی ایس) کی کتاب " موج کوثر " ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ۱۹۴۷ تک کی مسلم تحریکوں اور رہنماؤں کا ذکر ہے۔ اس کے ایک باب کا عنوان ہے " دور ردعمل کی خصوصیات " اس باب کے تحت وہ لکھتے ہیں:

" دورردعمل میں " پدرم سلطان بود " اور " ہیچو ما دیگرے نیست " کی آوازیں جس طرح بلند ہوئیں، اس پر دیدہ ور لوگوں نے کان کھڑے کئے اور آنکھیں دکھائیں۔ علامہ شبلی نے، جب وہ ابھی علی گڑھ سے وابستہ تھے اور سرسید کے رفیق کار تھے، اُن خدشات کو بڑے لطف سے نظم کیا جو سلف پرستی سے پیدا ہونے والے تھے:

سلف کا تذکرہ جو ہمت و غیرت کا ہے افسوں
ہمارے حق میں وہ سرمایۂ خواب پریشاں ہے

یہ افسانے بڑھاتے ہیں ہماری نیند کی شدّت
یہ افسوں حق میں اپنے اور مدہوشی کا ساماں ہے

ہمیں احساس تک ہوتا نہیں اپنی تباہی کا
کہ سب پیشِ نظر اسلاف کی وہ شوکت و شاں ہے

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سن کر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنونِ احساں ہے

مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں
کہ یورپ دولتِ عباس کا اب تک ثنا خواں ہے

نہیں رہنے کو یاں گھر تک، اگرچہ بے ر ہتے ہیں
کہ اب تک قصرِ حمرا قبلہ گاہِ رہ نورداں ہے

ہیں خود ان پڑھ، مگر اس زعم میں اترائے پھرتے ہیں
کہ دنیا میں ہمیں سے زندہ اب تک نامِ یوناں ہے

نظر آتے ہیں ہم کو عیب اپنے خوبیاں بن کر
ہم اپنے جہل کو بھی یہ سمجھتے ہیں کہ عرفاں ہے

نواب عماد الملک بلگرامی نے بھی اس کے چند سال بعد علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں کہا:

ہم مسلمانوں میں آج کل ایک نیا مرض شائع ہو گیا ہے۔ جس کو اسلاف پرستی کہتے ہیں ... ان حضرات نے آفت برپا کر دی ہے۔ کوئی مسلمانوں کی علمی دولت کو شمار کرتا ہے۔ کوئی تمدنی خوبیاں گنتا ہے۔ کوئی ہمارے مدارس اور یونیورسٹیوں کی فہرست تیار کرتا ہے۔ کوئی ہماری یونانی کتابوں کے ترجموں کا حساب دیتا ہے۔ کوئی اندلس کی حکومت کا زور دکھاتا ہے۔ کوئی ہارون اور مامون کی شان بیان کرتا ہے۔ اس میں شک

نہیں کہ اسلاف پرستی بہت عمدہ شیوہ ہے مگر اسی حد تک کہ ہم اپنے بزرگوں کی محنت، ان کی یک رنگی، ان کی نفس کشی کی تقلید کریں اور ان کا سا صبر و استقلال، ان کا سا انہماک طلب علم میں پیدا کریں... نہ یہ کہ ہمارے بزرگوار جو کچھ اپنے وقت میں کر گئے تھے، ان پر غرہ کریں اور مثل زنِ بیوہ کے ان کے نام پر بیٹھ رہیں اور ان کی علمی بزرگیوں کا تذکرہ دوسروں سے سن کر زمانۂ حال کی دولتِ علمی کو حقیر سمجھیں اور اس کے دریافت سے اغماض کریں۔" (موج کوثر ۸۳-۲۸۲)

اس زمانہ میں مسلمانوں کے احیاء نو کی سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ سمجھ لی گئی تھی کہ ماضی کی شاندار تاریخ کو یاد دلاکر لوگوں میں حال کا ولولہ پیدا کیا جائے۔ یہ مزاج اتنا بڑھا کہ خود مولانا شبلی نعمانی اس کا شکار ہو گئے جنھوں نے ابتدائی طور پر اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ بعد کے زمانہ میں انھوں نے خود بھی یہی کیا کہ دور فتوحات کے کارنامے بتا کر مسلمانوں میں جوش عمل پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

مگر یہ طریقہ سراسر بے فائدہ تھا۔ اس تدبیر میں بنیادی خامی یہ تھی کہ وہ "تیاری" کے دور کو حذف کر کے صرف "نتیجہ" کے دور کو نمایاں کر رہا تھا۔ وہ ابتدائی جدوجہد کو چھوڑ کر آخری منزل سے اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ ایسا سفر اس اسباب کی دنیا میں کبھی شروع نہیں ہوتا۔ چنانچہ سو سال کے پر جوش لفظی ہنگاموں کے باوجود وہ شروع بھی نہ ہو سکا، اور منزل پر پہنچنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

اس قسم کی تحریکیں آدمی کے اندر صرف فخر کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ حالاں کہ احیاء نو کے لئے اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر عمل کا جذبہ ابھارا جائے۔ اس طرح یہ طریقہ ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی وہ ہمارے حق میں ثابت ہوا۔ مسلمان فرضی بھرم میں مبتلا ہو کر ایک ایسی قوم بن گئے جس کے پاس الفاظ کی دھوم تو بہت ہے مگر حقیقی عمل کا سرمایہ اس کے پاس موجود نہیں۔

احیاءِ قلب ، احیاءِ حکومت

انسانوں کے اندر جب بھی بگاڑ آتا ہے تو اس کی جڑ ہمیشہ قلب میں ہوتی ہے۔ قلب کے بگاڑ سے زندگیاں بگڑ جاتی ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ کیا لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے قلب ہوتے جن سے وہ سمجھتے یا ان کے کان ہوتے جن سے وہ سنتے۔ کیوں کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ قلب اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں (الحج ۴۶)

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے کہ سن لو کہ انسانی جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے ، اور وہ قلب ہے (اَلَا وَ اِنَّ فِی الجسدِ مُضْغَۃً اذا اصلحت صَلَحَ الجَسَدُ کُلُّہ و اذا افسدت فَسَدَ الجسدُ کُلُّہ اَلَا وَھِیَ القلبُ (متفق علیہ)

جب ہر قسم کے انسانی بگاڑ کا سرچشمہ قلب ہے تو ہر بگاڑ کے موقع پر ہمیشہ اصلاح کا آغاز قلب کی اصلاح سے ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی اس آیت کا مطالعہ کیجئے :

کیا ایمان والوں کے لئے وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہوا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے آسمانی کتاب دی گئی تھی ، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے ، اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد۔ ہم نے تمہارے لئے نشانیاں بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو (الحدید ۱۶ - ۱۷)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر لمبی مدت (طول امد) گزرنے سے افراد کے قلوب میں سختی (قساوت) آجاتی ہے۔ اس سے ان کے اندر باتوں کو سمجھنے اور اس سے اثر لینے کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ جب کسی قوم کا یہ حال ہو جائے تو اس وقت کیا کرنا چاہئے ، اس کو زمین کی مثال کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔

جو زمین خراب ہو جائے ، اس میں کام کا آغاز فصل بونے سے نہیں کیا جاتا ، بلکہ زمین تیار کرنے سے کیا جاتا ہے۔ ایسی زمین سے پہلے اینٹ پتھر اور جھاڑ جھنکار صاف کیا جاتا ہے۔ اس کو ہموار کیا جاتا ہے۔ اس کی جتائی کر کے اس کو زرخیز بنایا جاتا ہے۔ پانی اور کھاد کا انتظام

کیا جاتا ہے۔

جب یہ سب کام ہو جائے، اس وقت زمین پیداوار کے لئے صالح ہو جاتی ہے۔ اب کسان اس زمین میں بیج ڈالتا ہے۔ جو کسان اس طرح زرعی عمل کرے، وہی اپنی زمین سے عمدہ فصل حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو کسان زمین کی تیاری سے پہلے اس میں دانہ بکھیر دے، وہ دانہ بکھیرنے کے باوجود اپنی زمین سے عمدہ فصل حاصل نہ کر سکے گا۔ کیوں کہ عمدہ فصل ہمیشہ تیار کی ہوئی زمین سے اگتی ہے نہ کہ غیر تیار شدہ زمین سے۔

قرآن کی یہ آیت اس بارہ میں قاطع حیثیت رکھتی ہے کہ کسی قوم پر جب تنزل کا دور آجائے تو اس کو دوبارہ اٹھانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ ایسی حالت میں وہی کرنا چاہئے جو مردہ (خراب) زمین پر کسان کرتا ہے۔ یعنی فصل بونے سے پہلے زمین تیار کرنا۔

اس قرآنی اصول کی روشنی میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھئے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان زوال کا شکار ہوئے۔ ان کی حکومتیں ختم ہوگئیں۔ قوموں کے درمیان ان کی عظمت باقی نہیں رہی۔ ماضی کے غالب لوگ حال کے مغلوب لوگ بن گئے۔

قرآن کے مذکورہ اصول کے مطابق۔ اب مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کا کام احیا قلب سے شروع ہونا چاہئے تھا نہ کہ احیاء حکومت سے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، انھوں نے تقریباً بلا استثنا یہ کیا کہ احیاء حکومت کے نعرہ سے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ قلب کی سطح پر قوم کو زندہ کرنے کی کوشش انھوں نے نہیں کی۔ ہر ایک نے یہ کیا کہ حکومت کی سطح پر کوشش کر کے قوم کی نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھنے لگا۔

خلافت تحریک، آزادی کی تحریک، تقسیم ملک کی تحریک، اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ دوسری تحریکیں بھی کم وبیش اسی خانہ میں جاتی ہیں۔ ان میں نام کے اعتبار سے یا الفاظ کے استعمال کے اعتبار سے بظاہر فرق نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں۔

اس غلطی کے نتیجہ میں مسلم رہنماؤں کا حال اس معمار کا ہوا جو ٹوٹے کھمبوں اور بوسیدہ دیواروں کے اوپر چھت کھڑی کرنے کی کوشش کرے۔ ایسی چھت کبھی قائم نہیں ہو سکتی اور نہ ایسا گھر

نہیں بن سکتا۔ ایسے گھر میں تعمیر کا آغاز کھمبوں اور دیواروں کی مضبوطی سے ہوگا نہ کہ چھت کا ڈھانچہ کھڑا کرنے سے۔

ماضی کی اس غلطی کی واحد تلافی یہ ہے کہ غلطی کا اعتراف کیا جائے۔ اور حال میں وہ کام شروع کر دیا جائے جو ماضی میں نہ ہوسکا۔ یعنی احیاء حکومت پر نظریں جمانے کے بجائے احیاء قلب پر اپنی ساری طاقت صرف کرنا۔ اس کے سوا ہر سرگرمی صرف وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس وقت تمام کاموں سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ مسلمان عمل اور نتیجہ کے فرق کو سمجھیں۔ اس دنیا میں جب بھی کوئی شخص کسی نتیجہ کو پاتا ہے تو وہ اس کے موافق ضروری عمل کرنے کے بعد اسے پاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص عمل کو حذف کر کے اچانک اپنے مطلوبہ نتیجہ کو پالے۔ ایسا کبھی کسی کے لئے نہیں ہوا، اور نہ آج وہ کسی کے لیے ہوسکتا ہے۔

مزید یہ کہ عمل محض حرکت کا نام نہیں ہے، بلکہ صحیح حرکت کا نام ہے۔ جو نتیجہ مطلوب ہو، اس کے مطابق ایک درست عمل ہوتا ہے۔ اس درست عمل کو اس کے تمام تقاضوں کے تحت انجام دینا پڑتا ہے اس ابتدائی مرحلہ کو اس کی تمام ضروری شرائط کے ساتھ گزارنے کے بعد ہی وہ وقت آتا ہے کہ آدمی اپنے مطلوب نتیجہ کو پائے۔

ضروری عمل کے بغیر نتیجہ کو پانے کے لئے دوڑنا ایک بے معنی اچھل کود ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ کسی کے حق میں نکلنے والا نہیں، خواہ اس نے اپنی اچھل کود کو اسلام کا خوبصورت نام کیوں نہ دے رکھا ہو۔

بابری مسجد کا مسئلہ

بابری مسجد۔ رام جنم بھومی کا مسئلہ یقینی طور پر حل ہوسکتا ہے۔ جس چیز نے اس کو اب تک لاینحل بنا رکھا ہے وہ خود مسئلہ نہیں ہے بلکہ طریق کار ہے۔ دنیا میں اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے مسئلے حل کئے گئے ہیں اور آج بھی حل ہو رہے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ مسئلہ حل نہ ہوسکے۔ لیکن جب طریق کار ہی غلط اختیار کیا جائے تو کوئی بھی مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

اس معاملہ میں جو لوگ اب تک براہ راست شریک رہے ہیں، ان کے پیش نظر بدقسمتی سے لیڈری زیادہ رہی ہے اور مسئلہ کا حل کم۔ اس لئے وہ اس معاملہ میں سنجیدہ طریق کار اختیار نہ کرسکے۔

دونوں فریق کی طرف سے اب تک جس طریقے کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ صرف ایک ہے۔ یعنی دعویٰ اور جواب دعویٰ۔ پریس یا پلیٹ فارم کے ذریعہ اب تک اس معاملہ میں دونوں فریق کے ذریعہ جو کیا گیا ہے وہ زیادہ تر یہی ہے۔ مگر اس طرح کے نازک مسئلہ کے حل کے لئے یہ طریقہ بنیادی طور پر غیر مفید ہے۔ اس طرح کے نزاعات میں اگر صرف دعویٰ اور مطالبہ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ہمیشہ ایسا ہوگا کہ ہر فریق دوسرے فریق کے جواب میں اپنے موافق کچھ الفاظ بول دے گا، اور پھر مسئلہ وہیں کا وہیں پڑا رہے گا۔

اس معاملہ میں اصلی اور پہلا کام یہ ہے کہ دونوں فریق کسی تیسرے فریق (تھرڈ پارٹی) کو تلاش کریں جس کا فیصلہ انھیں منظور ہوسکے۔ وہ پیشگی طور پر راضی ہو جائیں کہ یہ تیسرا فریق جو فیصلہ دے گا اسے دونوں فریق بلا بحث مان لیں گے۔

اس طرح کے کیس میں عدالت یہ تھرڈ پارٹی نہیں بن سکتی۔ الّا یہ کہ عدالتی فیصلہ سامنے آنے سے پہلے دونوں فریق اس کا باضابطہ اقرار نامہ دے چکے ہوں کہ عدالت جو بھی فیصلہ کرے گی اس کو وہ لازمی طور پر مان لیں گے۔ بصورت دیگر ایسا ہوگا کہ عدالت کا فیصلہ جس فریق کے موافق ہوگا وہ اس کو مانے گا، اور جس فریق کے خلاف ہوگا وہ اس کو ماننے سے انکار کر دے گا۔ اس طرح مسئلہ دوبارہ وہیں آجائے گا جہاں وہ پہلے تھا۔

عدالت کا فیصلہ اس وقت کام کرتا ہے جب کہ معاملہ ایک فرد یا چند افراد کا ہو۔ ایسی

صورت میں فرد یا افراد اگر عدالتی فیصلہ کو نہ مانیں تو پولیس اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ انھیں ماننے پر مجبور کیا جاسکے۔ مگر بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی کا مسئلہ دو افراد کا مسئلہ نہیں بلکہ دو قوموں کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اور جس مسئلہ میں دو پوری قوم شامل ہو جائے۔ اس میں عدالت کا فیصلہ قوم کی مرضی ہی سے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ قوم کی مرضی کے بغیر ایسے فیصلہ کا نفاذ ممکن نہیں۔

یہی خاص فرق ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ شاہ بانو کیس کے معاملہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کو نہ مانیں، اور ان کا نہ ماننا سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بے اثر بنا دے۔ اگر اس کی حیثیت صرف شخصی معاملہ کی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ شاہ بانو کے شوہر محمد احمد کے انکار سے ایک عدالتی فیصلہ کالعدم ہو کر رہ جائے۔

میرے نزدیک اس مسئلہ کا واحد قابل عمل حل یہ ہے کہ دونوں فریق ثالثی (arbitration) کے اصول پر راضی ہو جائیں۔ دونوں فریق پیشگی طور پر تحریری اقرار نامہ دیں کہ یہ ثالث (تھرڈ پارٹی) جو بھی فیصلہ دے گا اس کو وہ بلا بحث مان لیں گے۔ فیصلہ کے بعد وہ اس کے خلاف مزید کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ تقریباً چار سال پہلے یہ مسئلہ اس حل کے کنارے پہنچ چکا تھا مگر بعض مسلم لیڈروں کی ناقابل فہم نادانی کی بنا پر وہ عملاً واقعہ نہ بن سکا۔

ایک تاریخی میٹنگ

یہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی بات ہے۔ نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں اسی خاص مسئلہ پر ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہندو سائڈ اور مسلم سائڈ دونوں طرف کے ذمہ دار لوگ جمع ہوئے۔ ہندو سائڈ سے جو لوگ شریک ہوئے، ان میں دوسرے ذمہ داروں کے علاوہ مہنت اویدناتھ بھی تھے جو رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی کے صدر ہیں اور وشو ہندو پریشد کے ٹکٹ پر ایم پی بھی ہیں۔ مسلم سائڈ سے جو لوگ شریک ہوئے، ان میں سید شہاب الدین صاحب اور دوسرے ذمہ دار حضرات موجود تھے۔

اس میٹنگ میں میں بھی خصوصی دعوت پر شریک تھا۔ پہلے حسب عادت دونوں فریق اپنا اپنا دعویٰ پیش کرتے رہے اور ایک دوسرے کی بات کا جواب دیتے رہے۔ دعویٰ اور اس کی تردید کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔

آخر میں میں نے کہا کہ یہ طریقہ مسئلہ کو حل کرنے کا نہیں ہے۔ مسئلہ کے حل کی واحد تدبیر یہ ہے کہ

دونوں فریق ایک تھرڈ پارٹی کو ثالث بنانے پر راضی ہو جائیں اور پیشگی اس بات کا تحریری اقرار کریں کہ یہ تھرڈ پارٹی جو فیصلہ دے گی اس کو وہ منظور کریں گے۔ میں نے کہا کہ اس تھرڈ پارٹی کے لئے سب سے بہتر باڈی مورخین کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے تجویز پیش کی کہ ہندستان کے مسلّمہ مورخین جنھوں نے انڈین ہسٹری کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو ان کا ایک منتخب بورڈ بنا دیا جائے اور اس کو پورا اختیار دیا جائے کہ وہ تاریخی حقائق کی روشنی میں اپنا قطعی فیصلہ دے۔ وہ جو فیصلہ دے اس کو دونوں فریق بلا بحث مان لیں۔

میری اس تجویز کو ہندو سائڈ نے کسی بحث کے بغیر پوری طرح مان لیا۔ حتی کہ وہ میری تجویز کے اس جزء پر بھی راضی ہو گئے کہ اس بورڈ کے تقرر کو کسی بھی حال میں نظیر نہیں بنایا جائے گا، اور آئندہ کسی اور مسجد یا مساجد کے لئے اس قسم کے باب ہرگز نہیں کھولے جائیں گے۔ مہنت اوید ناتھ نے اس کو اتنا زیادہ پسند کیا کہ انھوں نے کھڑے ہو کر میرے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس تجویز کو فائنل کرنے کے لئے جلد ہی دوسری مٹینگ بلائی جائے۔

مگر عین اس وقت ایک "حادثہ" پیش آیا جس نے سارے معاملہ کو بگاڑ دیا۔ وہ یہ کہ جناب سید شہاب الدین صاحب ناقابل فہم طور پر اس کے مخالف ہو گئے۔ وہ اس مخالفت میں اتنا شدید ہوئے کہ تقریباً چیخنے لگے۔ حتی کہ ان کی چیخ پکار میں مٹینگ ختم ہو گئی۔

اس میٹنگ میں جماعت اسلامی کے نمائندہ کے طور پر افضل حسین صاحب مرحوم بھی موجود تھے۔ مگر وہ مکمل طور پر خاموش رہے۔ اگر مسلم نمائندوں نے اس موقع پر ناقابل فہم حد تک نادان رول نہ ادا کیا ہوتا تو یہ مسئلہ ۱۹۸۷ میں ہی ختم ہو جاتا اور ملک اور خاص طور پر مسلمان ان اندوہناک نقصانات سے بچ جاتے جو بعد کو اسی کے نتیجہ میں پیش آئے اور موجودہ سطروں کے لکھنے تک پیش آرہے ہیں۔

آج بھی اگر اس مسئلہ کا کوئی حل ہے تو یہی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیڈر صاحبان پچھلے تلخ تجربات کے بعد اب اس تجویز کی اہمیت کو محسوس کریں گے اور ذاتی وقار کا خیال کئے بغیر اس کی تائید کریں گے۔ نیز ہندو سائڈ جو ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو اس تجویز کو منظور کر چکی تھی، وہ دوبارہ اس کو مان کر مسئلہ کے حل کا قابل عمل راستہ نکالے گی۔

مسجد اسلام میں

اب میں مسجد کے بارہ میں مسلم نقطۂ نظر کو بتانا چاہتا ہوں۔ یہ بات صحیح ہے کہ مسجد اسلامی شریعت کے مطابق ایک مقدس جگہ ہے۔ جب ایک مقام پر مسجد بنادی جائے تو وہ جگہ ہمیشہ کے لئے مسجد ہوجاتی ہے اور مسلم عقیدہ کے مطابق اس کو کسی بھی طریقہ پر ختم یا تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

مگر جہاں مسجد کے بارے میں یہ شدید مسلم عقیدہ ہے۔ اسی کے ساتھ خود مسلم عقیدہ کے مطابق یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر مسجد غصب کی جگہ پر یا ناجائز جگہ پر بنائی جائے تو وہ مسجد نہیں ہوگی۔ وہاں نماز پڑھنا ناجائز ہوگا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں پر یہ فرض ہوگا کہ وہ اس جگہ کو اس کے اصل مالک کی طرف واپس لوٹادیں۔

اجودھیا کی مذکورہ عمارت کے حل کے لئے اگر مذکورہ تدبیر اختیار کی جائے تو وہ کسی بھی اعتبار سے مسلم عقیدہ سے نہیں ٹکراتی۔ اگر مورخین کا بورڈ یہ فیصلہ کرے کہ موجودہ عمارت جائز طور پر مسجد کی حیثیت سے بنائی گئی تھی تو اس کی موجودہ حیثیت علیٰ حالہ برقرار رہے گی۔ اس کے برعکس اگر مورخین کا بورڈ تاریخی حقائق کے حوالہ سے یہ فیصلہ دیتا ہے کہ موجودہ عمارت کی حیثیت جائز طور پر تعمیر کردہ مسجد کی نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس کو اصل مالکوں کی طرف لوٹا دینا ہی شریعت کا تقاضا ہوگا۔

بالفرض اگر مورخین کے بورڈ کا فیصلہ مسلمانوں کے موجودہ دعوی کے مطابق نہ ہو تب بھی مسلمانوں کو اسے قبول کرلینا چاہئے کیوں کہ مورخین کے فیصلہ کے بعد وہ ذاتی طور پر بری الذمہ ہوجاتے ہیں اس کے بعد خالص شرعی اعتبار سے ان کی کوئی پکڑ نہیں ہے۔ اس کے بعد خدا کے یہاں اگر کسی کی ذمہ داری ہے تو وہ مورخین کا بورڈ ہے نہ کہ مسلمان۔

ثالثی کا مسئلہ

یہاں میں ثالثی کے اسلامی اصول کے بارہ میں مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن میں ثالث (arbiter) کا اصول بتایا گیا ہے۔ بیوی اور شوہر میں باہمی نزاع ہو تو اس کو حل کرنے کے لئے یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ دو افراد کا ایک ثالثی بورڈ مقرر کرکے اس کو حل کیا جائے (۴ : ۳۵) قرآن کے انگریزی مترجم عبداللہ یوسف علی نے اس اصول کو بجا طور پر خاندانی جھگڑے کو حل کرنے کا بہترین طریقہ کہا ہے:

قرآن میں یہ حکم ابتداءً خاندانی نزاع کو حل کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے بعد یہ مسلم قانون کا ایک مستقل جزء بن گیا اور اسلامی تاریخ میں بار بار نزاعی معاملات اس اصول کے ذریعہ حل کئے گئے۔ یہاں میں اس نوعیت کی ایک مثال مختصراً درج کرنا چاہتا ہوں۔

بنو امیہ کے زمانہ میں دمشق میں جامع مسجد بنائی گئی جو ۷۱۵ء میں مکمل ہوئی۔ وہ آج بھی وہاں موجود ہے۔ اس مسجد کے بارہ میں شام کے عیسائیوں کو یہ شکایت تھی کہ اس میں ایک قدیم چرچ کا حصہ بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ عمر بن عبد العزیز ۷۱۷ء میں خلیفہ مقرر ہوئے۔ ۷۲۰ء میں خلیفہ کی حیثیت سے ان کا انتقال ہوا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز جو اسلامی تاریخ میں عمر ثانی کہے جاتے ہیں، ان کے پاس شامی عیسائیوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے شکایت کی کہ پچھلے خلیفہ نے ہمارے چرچ کو مسجد میں شامل کر دیا تھا۔ اب آپ انصاف کریں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے محمد بن سُوَید الفہری کو ثالث مقرر کیا۔ انھوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ عیسائیوں کی شکایت درست ہے۔ اس کے بعد عمر بن عبد العزیز نے حکم دیا کہ مسجد میں گرجا کا جو حصہ ہے وہ پوری زمین عیسائیوں کو دے دی جائے۔

تاہم اس حکم پر عملدرآمد کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ عیسائی اصلاً اسلامی انصاف کو آزمانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کو آزمایا اور اس کو پورا پایا۔ اس کے بعد انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اپنی خوشی سے یہ حصہ مسلمانوں کے عبادت خانہ کے لئے دیتے ہیں۔ (خلیفۃ الزاہد عمر بن عبد العزیز)

اوپر جو بات کہی گئی، وہ دینی اور تاریخی دونوں اعتبار سے انتہائی واضح ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد سیاسی لیڈروں کی بابت میں کوئی پیشگی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ وہ کسی اصول کے پابند نہ ہونے کی بنا پر قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) کے حامل نہیں۔ تاہم میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم علماء اور مسلم عوام دونوں میری اس تجویز سے اتفاق کریں گے۔ یہ تجویز عین شرعی حدود کے مطابق ہے، اس لئے مسلم علماء کے لئے اس کو قبول کرنا مشکل نہیں ہو سکتا۔ اور جہاں تک مسلم عوام کا تعلق ہے، وہ ہر چیز سے پہلے پر امن زندگی چاہتے ہیں، اور یہ تجویز بلاشبہہ ان کے لئے اس ملک میں پر امن زندگی کی یقینی ضمانت ہے۔

ایک انتباہ

میرا یہ مضمون اس سے پہلے انگریزی زبان میں نئی دہلی کے روزنامہ ہندستان ٹائمس کے شمارہ ۶ جنوری ۱۹۹۱ میں چھپا تھا۔ انگریزی اخبار میں اس کی اشاعت کے بعد ایک مسلم دانشور کا ٹیلیفون ملا۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے اپنے مضمون میں جو تجویز پیش کی ہے، وہ بہت پسندیدہ اور معقول ہے مگر آپ نے اس کو پیش کرنے میں تاخیر کر دی۔ یہ تجویز آپ کو بہت پہلے پیش کرنا چاہئے تھا۔

مذکورہ مسلم دانشور کے اس تبصرہ پر مجھے سخت تعجب ہوا۔ کیوں کہ عین اسی مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ ثالثی کی یہ تجویز میں نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو نئی دہلی کے ایک باضابطہ اجتماع میں پیش کی تھی۔ اس وقت میں نے اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کے تمام ضروری اجزاء کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اس میٹنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے اعلیٰ ذمہ دار اور نمائندے موجود تھے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود مذکورہ مسلم دانشور نے ایسی بات کیوں کہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیڈر اور ہمارے دانشور ایک عرصہ سے "خارجی عذر" کی اصطلاح میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ ہر ٹھوس بات کے مقابلہ میں ایک خارجی عذر کا حوالہ دے کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ یہ مزاج بلاشبہہ موجودہ زمانہ میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس مزاج کو ختم کرنا انتہائی ضروری ہے ورنہ ہم نہ کسی منصوبہ پر عمل کر سکیں گے اور نہ امکانات کو استعمال کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اس مزاج کی موجودگی میں ہماری بربادی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

دوعملی

عراق کے حکمراں صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ء کو کویت میں اپنی فوجیں داخل کردیں اور اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ اس پر تمام علمار نے مذمت کے بیانات دیے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سعودی حکمراں ملک فہد کے نام ٹیلی گرام بھیجا۔ اس ٹیلی گرام میں مولانا نے کویت پر عراق کے غاصبانہ قبضہ کی مذمت کی اور یہ اپیل کی کہ عراق اپنی فوجوں کو کویت سے واپس بلالے (اخبار العالم الاسلامی ۳ ستمبر ۱۹۹۰)

۱۶ ستمبر ۱۹۹۰ کو دہلی میں "کل ہند تحفظ حرمین شریفین کانفرنس" ہوئی۔ یہ کانفرنس مولانا منت اللہ رحمانی کی صدارت میں ایوان غالب میں ہوئی۔ اس کا افتتاح مسلم مجلس مشاورت کے صدر شیخ ذوالفقار اللہ نے کیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے علمار نے اس میں شرکت کی۔ کانفرنس میں متفقہ طور پر پاس کی گئی قرارداد میں کویت پر عراق کے غاصبانہ قبضہ کی پرزور مذمت کی گئی۔ مطالبہ کیا گیا کہ عراق بلاشرط اپنی فوجیں کویت سے واپس بلالے۔ اور کویت کو اس کے نقصانات کا معاوضہ ادا کرے۔ کانفرنس نے عراق کے حکمراں ٹولہ کے بے بنیاد پروپگنڈا کی مذمت کی اور کہا کہ مسلمان ان جھوٹے پروپگنڈوں سے متاثر نہ ہوں۔ (قومی آواز ۱۷ ستمبر ۱۹۹۰)

اس قسم کے مذمتی بیانات سراسر بے فائدہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیانات قیادت کے تقاضے کے تحت دیے جاتے ہیں نہ کہ اصول کے تقاضے کے تحت۔ اُن کی مذمت اگر اصولِ حق کی خاطر ہوتی تو وہ ہر غاصبانہ قبضہ کی مذمت کرتے۔ جب کہ وہ صرف اس غاصبانہ قبضہ کی مذمت کر رہے ہیں جس سے ان کا قیادتی مفاد وابستہ ہو۔

ہندستان میں انفرادی سطح پر عین اسی قسم کے قبضۂ غاصبانہ کے واقعات ہو رہے ہیں جیسا واقعہ کویت میں ہوا۔ مگر ہمارے علمار ان کی مذمت نہیں کرتے۔ عراق کے غاصب کے جھوٹے پروپگنڈوں کی وہ تردید کرتے ہیں، مگر اپنے ملک کے غاصب کے جھوٹے پروپگنڈوں کو مان کر وہ خود اس کے سرپرست بن جاتے ہیں۔

مسلم رہنماؤں کی یہ دوعملی موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس دوعملی نے ہمارے رہنماؤں کی تمام کارروائیوں کو بالکل بے اثر بنا دیا ہے۔ اس دوعملی کے باقی رہتے ہوئے ہرگز مسلمانان ہند کا بھلا ہونے والا نہیں۔

پیشگی جانچ

قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ جب اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچے تو ابراہیم نے اسماعیل سے کہا کہ اے میرے بیٹے ، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں ۔ پس تم سوچ لو کہ تمہاری رائے کیا ہے ۔ اسماعیل نے کہا کہ اے میرے باپ ، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس کو کر ڈالئے ، انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں پائیں گے (الصافات ۱۰۲)

اس آیت میں "صبر" کا لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے بیٹے اسماعیل کو لٹایا اور اپنے خواب کے مطابق ، ان کی گردن پر چھری چلائی تو اس فعل سے اللہ کا مقصود اسماعیل کو ذبح کرنا نہ تھا بلکہ ان کے صبر کا امتحان لینا تھا ۔ کیونکہ خدائی منصوبہ کے مطابق ، ان کو عرب کے بے آب و گیاہ صحرا میں آباد ہونا تھا ۔ وہاں مستقل مزاجی کے ساتھ آباد ہونے کے لیے صبر کی غیر معمولی صفت درکار تھی ، حضرت اسماعیلؑ نے پیشگی آزمائش کے مطابق یہ ثابت کر دیا کہ یہ ضروری صفت ان کے اندر مکمل طور پر موجود ہے ۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ انھیں صحرائے عرب میں چھوڑ کر چلے گئے ۔

اس واقعہ سے پیغمبرانہ طریق کار کا ایک اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے ۔ وہ یہ کہ جب کسی شخص یا کسی گروہ کو کسی بڑی مہم میں لگانا ہو تو سب سے پہلے مناسب امتحان کے ذریعہ یہ معلوم کیا جائے کہ آیا اس شخص یا اس گروہ میں وہ مطلوبہ صفت اطمینان بخش مقدار میں موجود ہے یا نہیں جو مہم میں کامیابی کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنے کے لیے ضروری ہوگی ۔

بنی اسرائیل کے رہنما نے یہی اصول اپنی قوم کے ساتھ اختیار کیا تھا جب انھوں نے دریا پار کرتے ہوئے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کوئی شخص اس سے پانی نہ پئے (البقرہ ۲۴۹) موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا ہر اقدام ناکامی سے دوچار ہوا ہے ۔ اور اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی اہلیت کے بارہ میں کبھی کوئی جانچ نہیں کی ۔ انھوں نے پرجوش تقریروں کے ذریعہ قوم کو اکسایا اور اس کے بعد اس کو صحراؤں اور سمندروں میں دوڑا دیا ۔

قول بلا فعل

ایک مسلمان بزرگ ہیں۔ وہ الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ تاہم انھیں اس سے اختلاف تھا کہ الرسالہ میں ہمیشہ صبر کی باتیں کی جاتی ہیں۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا: اب آپ کی کیا رائے ہے۔ اب تو حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ اب جہاد ناگزیر (inevitable) ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا عمل قرآن و حدیث کے تحت ہوگا یا اس سے آزاد۔ انھوں نے کہا کہ قرآن و حدیث کے تحت ہوگا، مگر کیا قرآن و حدیث میں جہاد اور جنگ کی باتیں نہیں۔ میں نے کہا کہ یقیناً ہیں۔ مگر قرآن کے مطابق یا صبر ہے یا جنگ۔ ان کے سوا کوئی تیسری صورت نہیں۔ اور آپ اسی تیسری صورت کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ "تیسری صورت" کیا ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن کے مطابق آپ کے لیے یا تو صبر کرنا ہے یا لڑنا ہے۔ یہی دو صورتیں اسلام کے مطابق اختیار کی جاسکتی ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی لڑائی نہ کرے، وہ صرف لڑائی کی بات کرے۔ یہ تیسری صورت قرآن کے نزدیک کوئی اسلامی عمل نہیں، بلکہ وہ ایک جرم ہے جو اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ بات قرآن و حدیث کی مختلف تصریحات سے ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو، تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت ناراضی کی بات ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرو نہیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے راستہ میں مل کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں (الصف ۲-۴) قرآن کی یہ آیتیں مدینہ کے ان مسلمانوں کی بابت اتریں جو لڑائی کی بات کرتے تھے مگر وہ عملاً لڑائی میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں خدا کی ناراضی کا اعلان کیا گیا۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے صبر کا حکم ہے۔ یہی میرا قول ہے اور میں اس قول پر عمل کر رہا ہوں۔ آپ حضرات کا قول اس کے برعکس یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے لڑائی کا حکم ہے۔ پھر آپ لوگ اپنے قول پر عمل کیجئے۔ ایسے لوگ اگر لڑائی نہ کریں، بلکہ صرف لڑائی کی بات کریں تو وہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک گناہ کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناراض کر دینے والا ہے۔ لڑائی نہ کرنا مگر لڑائی کی بات کرنا ایک نہایت سنگین روش ہے لیکن آج مسلمانوں کے عوام و خواص کی بیشتر تعداد اسی سنگین روش میں مبتلا ہے۔

قومی نہ کہ اسلامی

موجودہ زمانہ میں مسلمان جہاں جہاں آباد ہیں، خواہ وہ اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، ہر جگہ انھوں نے اسلام کے نام پر سرگرمیاں جاری کر رکھی ہیں۔ ان سرگرمیوں کو کچھ لوگ صحوہ اسلامیہ (اسلامی بیداری) کہتے ہیں۔ مگر یہ اس لفظ کا غلط استعمال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام نہاد سرگرمیاں نہ تو صحوہ ہیں اور نہ اسلامیہ۔ اسلام کے نام پر ہونے والی ان سرگرمیوں کو صحیح طور پر صرف ایک نام دیا جاسکتا ہے، اور وہ منفی ردّ عمل ہے۔

ان سرگرمیوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو ان سب میں ایک چیز مشترک طور پر موجود ملے گی۔ اور وہ ہے کسی نہ کسی دوسرے گروہ کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف لفظی یا عملی تحریک چلانا۔ کسی ملک میں یہ تحریک خود اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کے خلاف چل رہی ہے۔ جن کو یہ تحریک چلانے والے بددین یا دشمنوں کا ایجنٹ کہتے ہیں۔ کہیں یہ تحریک غیر مسلم قوم کے خلاف جاری ہے جو "مسلم دشمن" ہونے کی بنا پر ان تحریکوں کی حریف بنی ہوئی ہیں۔ کہیں کوئی حکمراں گروہ اسلامی قانون کی راہ میں رکاوٹ نظر آتا ہے، اس لیے اس کو اقتدار سے ہٹانے کے نام پر ہنگامے کیے جارہے ہیں۔

صحوہ اسلامیہ کے تحت چلنے والی تمام تحریکوں کا نشانہ احتساب غیر ہے۔ جب کہ صحیح اسلامی تحریک وہ ہے جس کا نشانہ احتساب خویش ہو۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ سرگرمیاں حقیقۃً صحوہ اسلامیہ کا معاملہ نہیں۔ یہ صرف ماحول کے خلاف منفی ردعمل ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

قومی ہنگاموں اور منفی ردّ عمل کو اسلام بتانا اور اس کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کرنا بلاشبہ جرم ہے۔ اور موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام رہنما اور دانشور اس جرم میں مبتلا ہیں۔ یہ عین وہی جرم ہے جس میں اس سے پہلے یہود مبتلا ہوئے۔ یہ قرآن کے الفاظ میں، آیات الٰہی کے بدلے ثمن قلیل خریدنا ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں اسی کا نام استغلال (exploitation) ہے۔ یعنی قومی اور دنیوی سرگرمیوں کو مذہب کا نام دینا۔

المطففین

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ ، اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو (ہود ۸۵) جب تم ناپ کر دو تو پورا ناپو اور ٹھیک ترازو سے تول کر دو ۔ یہ بہتر طریقہ ہے اور اس کا انجام اچھا ہے (بنی اسرائیل ۳۵) تم لوگ پورا پورا ناپو اور نقصان دینے والوں میں سے نہ بنو ۔ اور سیدھی ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ (الشعراء ۱۸۱ - ۸۳) اللہ نے آسمان کو اونچا کیا اور اس نے ترازو رکھ دی کہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو ، اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور تول میں نہ گھٹاؤ (الرحمٰن ۷ - ۹)

ان آیتوں میں جس چیز سے روکا گیا ہے ، وہ قرآن کی زبان میں تطفیف ہے ۔ قرآن کی سورہ نمبر ۸۳ میں اس کی بابت زیادہ سخت الفاظ میں حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے ، جن کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں ، اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیں تو انھیں گھٹا کر دیں ۔ کیا ایسا کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں ، ایک بڑے دن کے لئے ۔ جس دن تمام انسان خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے (التطفیف ۱ - ۶)

ویلٌ للمطففین کی تشریح مفسر النسفی نے ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ لوگ جو انسانوں کے حقوق کو ناپنے اور تولنے میں گھٹا دیتے ہیں (للذین یبخسون حقوق الناس فی الکیل و الوزن) اس آیت کا تعلق صرف ان چند افراد سے نہیں ہے جو دکانداری کرتے ہوں اور ترازو میں تول کر کوئی چیز بیچ رہے ہوں ، بلکہ اس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے ۔ ناپ اور تول سے مراد دراصل انسانی حقوق کی ادائگی ہے ۔ یہاں ترازو کی مثال سے بتایا گیا ہے کہ لین اور دین دونوں برابر رکھو ۔ جس طرح تم اپنا حق پورا لینا چاہتے ہو ، اسی طرح دوسروں کو بھی ان کا پورا حق دو ۔ یہ طریقہ نہ اختیار کرو کہ اپنے لئے دوسرا باٹ اور غیروں کے لئے دوسرا باٹ ۔

اس اخلاقی کمزوری کا اظہار سب سے زیادہ اختلاف والے معاملات میں ہوتا ہے ۔ ایک شخص

کا دوسرے شخص سے مال یا جائداد کا جھگڑا ہو۔ اس سے آپ بات کریں تو وہ پوری کہانی کو یک طرفہ انداز میں بتائے گا جس سے ثابت ہو کہ وہ حق پر ہے اور دوسرا شخص ناحق پر۔ یہی تطفیف ہے جس پر ویل (خرابی) کی خبر دی گئی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ پورے معاملہ کو جیسا ہے ویسا (as it is) بیان کرے، خواہ وہ اپنے موافق ہو یا اپنے خلاف۔

یہی حال تمام اختلافی امور کا ہے۔ آدمی اگر دوسرے کی زیادتی کو بتائے اور اپنی زیادتی کا ذکر نہ کرے تو وہ مطفف ہے، اور مطفف کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں نہایت برے انجام کا اندیشہ ہے۔ وہ اپنی یک طرفہ باتوں سے دنیا والوں کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے، مگر وہ خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

اس ذہنیت کا سب سے بڑا اظہار آج کل فرقہ وارانہ فساد کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ ہندستان میں پچھلے پچاس برس سے ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ ان فسادات کی تعداد، چھوٹے اور بڑے واقعات کو ملا کر، ۵۰ ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ ہر بار جب کہیں فساد ہوتا ہے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی رپورٹیں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ نام نہاد رپورٹیں، تقریباً سب کی سب، تطفیف کی مثال ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان رپورٹوں میں ہمیشہ فریق ثانی کی زیادتیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ فریق اول نے کیا کیا، اس کا ان رپورٹوں میں کوئی ذکر نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو ایک شہر میں فساد ہوا۔ اس کی ابتدا یہاں سے ہوئی کہ ہندو فرقہ کے کچھ لوگ اپنا ایک مذہبی جلوس نکال رہے تھے۔ ان کے نقشہ کے مطابق جلوس کو ایک ایسی سڑک سے گزرنا تھا جس پر مسلم محلہ واقع تھا اور مسلمانوں کی مسجدیں تھیں۔ مسلمانوں نے روٹ بدلنے پر اصرار کیا دوسری طرف ہندوؤں کا اصرار تھا کہ وہ اسی روٹ پر جائیں گے۔

اس واقعہ کے صرف ایک ماہ بعد، ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ملک کا جنرل الکشن ہونے والا تھا۔ حکمراں پارٹی کو دونوں فرقہ کا ووٹ لینا تھا، اس لئے وہ نہ ہندوؤں کو ناراض کرنا چاہتی تھی اور نہ مسلمانوں کو۔ چنانچہ حکومت نے یہ انتظام کیا کہ جلوس کو پولیس کے خصوصی بندوبست کے تحت نکالا جائے۔

جلوس اس طرح چلتا ہوا مسلم محلہ والی سڑک پر پہنچا۔ بھاری تعداد میں پولیس کی موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ جلوس کے لوگ خواہ الٹے قسم کے نعرے لگائیں مگر وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی عملی تشدد

نہ کر سکیں گے۔ مگر مسلمانوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت یہ کیا کہ وہ اپنے محلہ والی سڑک پر جمع ہوگئے اور جلوس کو روک دیا۔ اس طرح کئی گھنٹے تک جلوس وہاں رکا رہا۔ جب جلوس والے واپسی پر راضی نہ ہوئے تو مسلمانوں نے دوسری نادانی یہ کی کہ اپنے گھروں کی چھتوں سے جلوس پر بم پھینکے حتی کہ انھوں نے مبینہ طور پر پولیس کو بھی اپنے بم کا نشانہ بنایا۔

یہاں پہنچ کر سارا معاملہ بالکل بدل گیا۔ بم اور پتھراؤ سے پہلے سارا معاملہ انتظام کا معاملہ تھا، اب وہ غصہ اور انتقام کا معاملہ بن گیا۔ اس سے پہلے ایک طرف پولیس تھی اور دوسری طرف جلوس کے ہندو۔ مگر اب پولیس اور ہندو ایک طرف ہوگئے اور مسلمان دوسری طرف۔ جن مسلمانوں کی حیثیت پہلے زیر حفاظت فرقے کی تھی، ان کی حیثیت اب زیر انتقام فرقے کی بن گئی۔ پولیس نے اور ہندوؤں نے مشتعل ہو کر مسلمانوں کو مارنا اور پھونکنا شروع کر دیا جس کی تفصیل اخبارات میں آچکی ہے۔ جب آدمی غصہ میں آجائے تو وہ اس وقت وہ سب کچھ کرتا ہے جو اس کے بس میں ہو۔ چنانچہ ہندو اور پولیس والے جب غصہ میں آ گئے تو انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔

۲۴ اکتوبر کے اس فساد پر مسلم رہنماؤں اور مسلم دانشوروں کی طرف سے سیکڑوں "رپورٹیں" اخبارات ورسائل میں آچکی ہیں۔ مگر یہ تمام کی تمام رپورٹیں تطفیف کی مثال ہیں۔ ان میں واقعہ کے نصف ثانی کو بیان کیا گیا ہے، مگر واقعہ کے نصف اول کا ان نام نہاد رپورٹوں میں کوئی ذکر نہیں۔

جو لوگ اس قسم کی رپورٹیں یا "آنکھوں دیکھا حال" بیان کرتے ہیں۔ وہ وہی ہوتے ہیں جو فساد کا واقعہ ہو جانے کے بعد سفر کر کے وہاں پہنچتے ہیں۔ مثلاً فساد کا آغاز اگر ۲۴ اکتوبر کو ہوا اور اس کا سلسلہ کچھ دنوں تک جاری رہا تو ایسے لوگ ہمیشہ فساد کے بعد، مثلاً ۱۰ نومبر کو فساد زدہ مقام پر پہنچیں گے۔ اس وقت جو منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، بس وہ اسی کو جذباتی انداز میں بیان کرنا شروع کر دیں گے۔ یعنی وہ اپنی رپورٹ ۱۰ نومبر سے شروع کریں گے نہ کہ ۲۴ اکتوبر سے۔ اس قسم کی رپورٹیں یا اس قسم کے بیانات مکمل طور پر تطفیف کی مثال ہیں۔ یہ اپنے آپ کو اخفاء واقعہ کے باٹ سے تولنا ہے اور فریق ثانی کو اظہار واقعہ کے باٹ سے۔ اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ تطفیف کا طریقہ اختیار کریں ان کے حصہ میں ویل (خرابی) لکھی جائے نہ کہ اصلاح اور کامیابی۔

پچھلے پچاس برس کی تاریخ قرآن کے ان الفاظ کی تصدیق کرتی ہے۔ اس مدت میں مسلم رہنماؤں

اور دانشوروں کی طرف سے لاکھوں کی تعداد میں رپورٹیں اور بیانات شائع کئے گئے ہیں ۔مگر ان رپورٹوں اور بیانات کا ایک فیصد فائدہ بھی ملت کو نہیں ملا ، حتی کہ اتنا فائدہ بھی نہیں جتنا ان کے چھاپنے اور تقسیم کرنے پر خرچ کیا جاتا رہا ہے۔ فسادات ، اپنی کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے برابر جاری ہیں بلکہ اور بڑھتے جارہے ہیں ۔

مسلم رہنما اگر ایسا کرتے کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کا نصف ثانی بتانے کے ساتھ ، اس کا نصف اول بھی بتاتے تو انھیں اللہ کی مدد حاصل ہوتی اور یقینی طور پر اب تک اس قسم کے فساد کا خاتمہ ہوجاتا۔

موجودہ قسم کی رپورٹیں اور بیانات کو پڑھ کر ہر جگہ کے مسلمانوں میں صرف غصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور غصہ اور نفرت یقینی طور پر اصل مسئلہ کو مزید بڑھانے والا ہے ، وہ ہرگز اس کو کم کرنے والا نہیں۔

اس کے برعکس اگر ہماری رپورٹوں اور بیانات میں واقعہ کا نصف اول بھی پوری طرح بیان کیا جاتا تو اس کے بعد مسلمانوں میں یہ احساس ابھرتا کہ اگر انھوں نے غلطی کی تو ہم نے بھی غلطی کی تھی۔ دونوں میں مقدار کا فرق تو ضرور ہے ، مگر دونوں میں نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ یہ معاملہ یک طرفہ معاملہ نہیں ہے ، بلکہ وہ دو طرفہ معاملہ ہے۔

اس احساس کا ایک تعمیری فائدہ یہ ہوتا کہ مسلمانوں میں خود احتسابی کا جذبہ ابھرتا۔ انھیں نظر آتا کہ فسادات کی شدت کے باوجود ، ان کا ایک آسان حل بھی یہاں موجود ہے ۔ وہ یہ کہ ہم اپنے حصہ کی غلطی کو ختم کر دیں ۔ اس طرح قانون قدرت کے تحت ، ہم یہ امید کرسکتے ہیں کہ انشاءاللہ دوسرے کی غلطی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

اس طرح کے مواقع پر بہترین حل یہ ہے کہ جب بھی کسی مقام پر فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہو تو مسلمان مقامی ذمہ داروں اور پولیس کے اعلیٰ افسران سے رابطہ قائم کریں۔ وہ منصوبہ بند طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ معاملہ پولیس اور جلوس کے درمیان رہے۔ مگر مسلمان اپنی بے صبری سے خود ہی اقدام کر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح بے بنیاد طور پر مسئلہ مسلمانوں اور پولیس کا بن جاتا ہے۔ مسلمان اگر اس راز کو جان لیں تو اس کے بعد ۹۹ فیصد فسادات کا علاج اپنے آپ ہو جائے گا۔

پیغمبر کا فیصلہ

بخاری اور مسلم نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے خطبہ دیا اور ہر وہ بات بیان کی جو آپ کے زمانہ سے لے کر قیامت تک ہونے والی تھی (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۸۰)

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں مستقبل کی باتیں نقل کی گئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک بات وہ ہے جو ابو داؤد نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

عن ثوبان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يوشك الأمم ان تداعى عليكم كما تداعى الأكلة الى قصعتها۔ فقال قائل: ومن قلة نحن يومئذ۔ قال بل انتم يومئذ كثير۔ ولكنكم غثاء كغثاء السيل و لينزعن الله من صدور عدوكم المهابة منكم وليقذفن في قلوبكم الوهن۔ قيل وما الوهن يا رسول الله۔ قال حب الدنيا وكراهية الموت۔

(جامع الاصول ، ۱۰ / ۲۸)

حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ قومیں تمہارے اوپر ٹوٹ پڑیں جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر ٹوٹتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا، کیا اس لیے کہ اس وقت ہم لوگ کم تعداد میں ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ اس وقت تم لوگ بہت زیادہ ہوگے۔ مگر تم لوگ سیلاب کے جھاگ کی مانند ہوگے، اللہ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت نکال دے گا۔ اور تمہارے دلوں میں کمزوری پیدا کر دے گا۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، کمزوری کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کی محبت، اور موت کو ناپسند کرنا۔

اس حدیث کے الفاظ پر غور کیجئے اور امت مسلمہ کے موجودہ حالات کو دیکھئے۔ معلوم ہوگا کہ آج امت پر عین وہی زمانہ آگیا ہے جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ۱۴ سو سال پہلے

پیشین گوئی فرمائی تھی۔ موجودہ مسلمان، خواہ وہ اقلیتی ملک میں ہوں یا اکثریتی ملک میں، ہر جگہ وہ دوسری قوموں کے استحصال اور زیادتی کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ساری دنیا میں ایک ارب کی غیر معمولی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ حقیر اور مظلوم بنے ہوئے ہیں۔

اب دیکھئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آنے والے دور کے بارہ میں جو ارشاد فرمایا ہے وہ کیا ہے۔ اس حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کی قومیں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گی اور ان کو اپنے ظلم اور استحصال کا نشانہ بنائیں گی۔ مگر اس خارجی مسئلہ کا سبب تمام تر داخلی مسئلہ بتایا گیا ہے۔ اس میں کھلے لفظوں میں یہ نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ ناموافق صورت حال اس لیے پیش آئے گی کہ مسلمان دنیا کی طلب میں پھنس جائیں گے اور اپنے ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر اعلیٰ دینی مقصد کے لیے قربانی کرنے کا جذبہ ان کے اندر باقی نہیں رہے گا۔ گویا مسئلہ باہر سے پیدا ہوگا مگر اس کا سبب خود مسلمانوں کے اپنے اندر ہوگا۔

اس کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ان الفاظ کو دیکھئے جو ان کے تمام اصاغر واکابر لکھنے اور بولنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کے سب بلا استثنار ایک ہی بولی بول رہے ہیں۔ اور وہ ہے ــــــ اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے کر ان کے خلاف لامتناہی چیخ پکار جاری رکھنا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان عربی، اردو، فارسی اور انگریزی میں اس معاملہ میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب کا سب الفاظ کے فرق کے ساتھ ایک ہی ہے، اور وہ دوسری قوموں کی مذمت ہے۔ ان میں سے کوئی موامرہ کا لفظ بولتا ہے اور کوئی سازش کا اور کوئی (conspiracy) کا۔ مگر سب کے کلام کا خلاصہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دوسری قومیں ہمارے خلاف سازشیں کر رہی ہیں۔ دوسری قومیں ہمارے اوپر ظلم کر رہی ہیں۔ دوسروں نے ہمیں تباہی اور مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔

مسلمان اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نصیحت پر دھیان دیتے تو وہ اپنی ساری کوشش اپنی اندرونی کمیوں کو دور کرنے پر لگا دیتے۔ مگر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر چھوٹا اور بڑا، اور ان کا ہر لکھنے اور بولنے والا

غیر قوموں کی سازشوں کا انکشاف کرنے میں مشغول ہے ۔ وہ دوسروں کے ظلم پر احتجاج کرنے میں اپنے تمام الفاظ خرچ کردینا چاہتا ہے ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے یہی روگردانی موجودہ مسلمانوں کی تمام بربادیوں کا اصل سبب ہے ۔ مسئلہ کے اصل سبب کو دور کرنے کے لیے وہ کوئی محنت نہیں کرتے ۔ اس کے برعکس ایک فرضی چیز کو سبب قرار دے کر اس کے اوپر اپنی ساری توانائیاں خرچ کر رہے ہیں ۔ ایسی ہر کوشش لغویت کی حد تک بے معنی ہے ۔ اس کا ہرگز کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ۔ خواہ مسلمان پچاس ہزار سال تک اس کی چٹان پر اپنا سر پٹکتے رہیں ۔

علم طب اگر کسی بیماری کے بارہ میں یہ بتائے کہ اس کا سبب انسان کے جسم کے اندر ہے تو کوئی آدمی یہ نادانی نہیں کرے گا کہ وہ اس قسم کے مرض کے علاج کے لیے بیرونی مرہم تلاش کرنے لگے ۔ کوئی مشین کام نہ کر رہی ہو ، اور انجینئر اس کو دیکھ کر کہے کہ اس کا سبب اس کے اندرونی پرزہ کی خرابی ہے ، تو کوئی آدمی مشین کے باہر پالش کر کے اس کو چلانے کی کوشش نہیں کرے گا ۔ مگر مسلمانوں کے مسئلہ کے بارہ میں ان کے پیغمبر کا کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ ان کے مسئلہ کا سبب ان کا داخلی نقص ہے نہ کہ بیرونی سازش ، اس کے باوجود مسلمانوں کے تمام رہنما بیرونی سازشوں کا انکشاف کر رہے ہیں اور ان کے خلاف چیخ پکار کرنے میں مشغول ہیں ۔ شاید موجودہ مسلمانوں کو پیغمبر کی رہنمائی پر اتنا یقین بھی نہیں ہے جتنا ایک مریض کو اپنے ڈاکٹر پر اور ایک مشین والے کو اپنے انجینئر پر ہوتا ہے ۔

قابل عمل، ناقابل عمل

ایک دھوبی ایک روز اپنے گدھوں کو لے کر گھر سے گھاٹ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک محلّہ تھا۔ محلّہ والوں نے کہا کہ تمہارے گدھوں کو ہم اس شرط پر اپنے محلہ سے گزرنے دیں گے کہ وہ آواز نہ نکالیں، کیوں کہ گدھے کی آواز ہم کو پسند نہیں۔ دھوبی نے جواب دیا: آپ لوگوں کی یہ شرط تو میں مان سکتا ہوں کہ میرے گدھے کسی کو لات نہ ماریں، مگر یہ شرط میرے بس سے باہر ہے کہ میرے گدھے کوئی آواز نہ نکالیں۔

یہ واقعہ فرقہ وارانہ فساد کے معاملہ کو بہت خوبی کے ساتھ بتا رہا ہے۔ ہندستان کے بیشتر فسادات کی بنیاد یہ ہے کہ ایک فرقہ اپنا جلوس نکالتا ہے۔ وہ چلتے ہوئے شہر کی ایسی سڑک سے گزرتا ہے جس کے کنارے دوسرے فرقہ کے مکانات ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ یہ کرتے ہیں کہ جلوس والے جلوس تو نکالیں مگر وہ اشتعال انگیز نعرہ نہ لگائیں۔ جلوس اس شرط کو پورا نہیں کر پاتا۔ جلوس کے کچھ افراد اشتعال انگیز نعرے لگا دیتے ہیں۔ اس پر دوسرا فرقہ بھڑک کر پتھر مارتا ہے۔ اس کے جواب میں فریق ثانی مزید مشتعل ہو کر گولیاں چلاتا ہے، اور پھر وہ فساد برپا ہوتا ہے جس میں ساری آبادی تہس نہس ہو کر رہ جاتی ہے۔

جلوس نکالنا بلاشبہ ایک سطحی کام ہے۔ اس میں سطحی قسم کے لوگ ہی حصہ لیتے ہیں۔ سنجیدہ اور پڑھے لکھے لوگ کبھی جلوس وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں جلوس، انسانی گدھوں کی بھیڑ کا نام ہے۔ ایسے لوگوں سے یہ مانگ کرنا کہ وہ نعرہ نہ لگائیں، سراسر ناقابل عمل ہے۔ وہ لازمی طور پر نعرہ لگائیں گے، حتیٰ کہ دل آزار نعرے بھی۔

ہم کو چاہیے کہ ہم قابل عمل اور ناقابل عمل کے فرق کو سمجھیں۔ ہم قابل عمل کی مانگ کریں اور جو ناقابلِ عمل ہے اس کو نظر انداز کر دیں۔ ہم قول پر صبر کریں (المزمل ۱۰) اور عمل پر پابندی لگانے کی کوشش کریں۔ ایسے مواقع پر ہم کو نعرہ کی بات سے اعراض کرنا چاہیے۔ ہم کو ایڈمنسٹریشن سے صرف یہ مانگ کرنا چاہیے کہ وہ جلوس کو تشدد کی کارروائی کرنے سے روکے۔ ہم اگر اس حکمت کو اختیار کر لیں تو ملک سے فرقہ وارانہ فسادات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

اس دنیا میں ممکن کی مانگ ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے، اور ناممکن کی مانگ ہمیشہ ناکامیاب۔

ایک اقتباس

مختلف بابری مسجد کمیٹیوں کے لیڈر پچھلے تین برس سے مسلسل بابری مسجد کے سلسلہ میں بڑے بڑے بیان دیتے آئے ہیں۔ بلند بانگ دعوے کرتے آئے ہیں۔ اپنے جذباتی بیانات اور زوردار تقریروں سے خوب مسلمانوں کی واہ واہ لوٹ کر قوم کے لیڈر بنتے رہے ہیں۔ ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں پر یہ تاثر قائم کرتے رہے ہیں کہ مسلم ووٹ ان کی مٹھی میں ہے۔ وہ جہاں کہیں گے مسلمان ووٹ ڈالے گا۔ وہ مسلم ووٹ کے نام پر اپنا مفاد پورا کرتے ہیں۔ جنھیں ان کے محلے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا راتوں رات مسلمانوں کے لیڈر بن گئے۔ انھوں نے مسلم فوج بنانے کا دعویٰ کیا۔ انھوں نے اجودھیا مارچ کا نعرہ لگایا۔ ان قائدین ملت نے شہیدی دستے بنائے۔ انھوں نے لاکھوں کی تعداد میں حفاظتی دستے اجودھیا بھیجنے کا اعلان کیا۔ آج ہندستان کے مسلمان اگر یہ سوال کر رہے ہیں کہ یہ مسلم فوج، یہ شہیدی دستے اور یہ حفاظتی دستے کہاں ہیں تو کون سا غلط کر رہے ہیں۔ مگر جب پچھلے برس رام مندر کا شلانیاس ہوا تو ان شہیدی دستوں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ فیض آباد کی ٹاٹ والی مسجد میں صرف سوا سو ڈیڑھ سو مسلمان جمع تھے۔ اور جب اڈوانی کی رتھ یاترا نکلی تو انھوں نے مسلمانوں پر اپنی بہادری کا سکہ جمانے کے لئے رتھ یاترا روکنے کا اعلان کیا۔ ان کے اس اعلان سے فتح پوری مسجد کے نائب امام کو ترشول تو لگ گیا مگر اس رتھ یاترا کو روکنے کے لئے چڑیا کا بچہ بھی سامنے نہیں آیا۔ انھوں نے حفاظتی دستے کے تحت بابری مسجد کی حفاظت کے لئے پانچ لاکھ مسلمانوں کو اجودھیا بھیجنے کا اعلان کیا مگر پانچ مسلمان لیڈر اجودھیا تو دور کی بات ہے فیض آباد بھی نہیں پہنچے۔

پچھلے گیارہ ماہ میں بی جے پی والے حکومت کے حمایتی ہونے کے باوجود مسلسل منظم طور پر اجودھیا پر دھاوا بولنے اور بابری مسجد میں گھسنے کی تیاری کرتے رہے۔ مگر یہ بابری مسجد کے لیڈر صرف وزیر اعظم وی پی سنگھ سے ملاقاتیں کرکے اور ٹیلیویژن و ریڈیو پر اپنے بیانات جاری کرا کر خوش ہوتے رہے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں اپنی پوزیشن بنانے کے لئے یہ حفاظتی دستے اور شہیدی دستے بنانے کے لمبے چوڑے بیانات دیتے رہے۔ اپنے ان خالی خولی بیانات سے انھوں نے صرف اور صرف فرقہ پرست ہندو تنظیموں کو تقویت پہنچانے کا کام کیا۔ مسلم فوج کا خوب ڈھول پیٹا گیا۔ مسلم فوج نے بجرنگ

دل ،شیوسینا ، وشو ہندو پریشد کے وجود کا جواز تو فراہم کیا مگر میرٹھ ، بھاگلپور ،گونڈا ، جے پور، دہلی اور دوسرے درجنوں فسادات میں ایک مسلمان کی جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکے۔ ان کا کھیل صرف اتنا رہا کہ وہ ملک کی اہم سیاسی جماعتوں سے یہ تسلیم کرالیں کہ یہ مسلم ووٹوں کے واحد ٹھیکیدار ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی سیاسی جماعت کامیاب نہیں ہوگی۔ انھوں نے نہ تو حکومت سے مسلمانوں کے اقتصادی سماجی ودینی مسائل حل کرنے میں کوئی دلچسپی دکھائی۔ نہ مسلمانوں کو منظم کیا۔ نہ انھیں اعتماد اور حوصلہ دیا۔ نہ ہندو فرقہ پرستوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی ٹھوس حکمت عملی بنائی۔ نہ ان کے مفاد میں کوئی دوررس پالیسی مرتب کی۔

جب تک یہ عناصر اقتدار سے دور رہے، جذباتی تقریریں کرکے مسلمانوں کو ٹکراؤ کے راستے پر چلاتے رہے۔ ان کی اسی ٹکراؤ کی پالیسی کا خمیازہ کروروں مسلمانوں کو میرٹھ ، ملیانہ ،بھاگلپور، بدایوں، کیرانہ ، دہلی ، بارہ بنکی ، الٰہ آباد ،حیدرآباد ، اندور ،جے پور ،گونڈا ،متھرا ، کانپور اور درجنوں فسادات کی شکل میں بھگتنا پڑا۔ آج بھی ملک کے درجنوں شہر میں بھگتنا پڑرہا ہے۔ اور آئندہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ پرانی کہاوت ہے کہ چھیڑو مت اور چھیڑو تو چھوڑو مت۔ لیکن بغیر نتائج کی پروا کئے یہ قائدین و قتی تالیاں بجوانے اور لیڈری چمکانے کے لئے ہندو فرقہ پرستوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ انھیں اپنی مسلم دشمنی کا جواز فراھم کرتے رہے۔ لیکن ٹکراؤ کا اعلان کرنے کے بعد ، حالات کو بگاڑنے کے بعد خود ہمیشہ پیچھے ہٹ گئے۔ ان کی اس عاقبت نااندیشانہ پالیسی کا خمیازہ عام مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ آج بھی بھگتنا پڑرہا ہے اور ابھی برسوں بھگتنا پڑے گا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمان کبھی اتنا غیر محفوظ نہیں رہا جتنا کہ آج ہے۔ آج مسلمانوں کا جان و مال ہی نہیں ان کی مسجدیں ، درگاہیں ،قبرستان ان کا دین ایمان سب خطرے میں ہے۔ آج مسلمان بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ آج مسلمان زبردست خوف وہراس کا شکار ہیں۔ اس کے لئے جہاں ملک کی سیاسی جماعتیں اور ہندو فرقہ پرست تنظیمیں ذمہ دار ہیں وہاں بابری مسجد کے نام پر لیڈری چمکانے والے یہ قائدین ملت بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ آج اگر عام مسلمانوں کا اعتماد ان نام نہاد مسلم لیڈروں پر سے اٹھ گیا ہے تو کیا غلط ہے۔ آج مسلمان مایوسی کے ایسے اندھیرے میں گھر گیا ہے جہاں اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی ہے۔ مگر مسلمان کے لئے مایوسی حرام ہے۔ مسلمان

کو آج اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا ہوگا۔ اپنے نادان دوستوں اور مفاد پرست بہی خواہوں کو پہچاننا ہوگا۔ اور منظم طور پر اپنی حفاظت، اپنی ٹھوس تعمیر، اپنی تعمیر و ترقی کا راستہ متعین کرنا ہوگا۔ اور یہ اس وقت ہی ممکن ہے کہ جب تعلیم یافتہ، بےلوث اور سمجھدار مسلمان آگے آئیں۔ عام مسلمان لمبے لمبے دعوے کرنے والے لیڈروں کی اصلیت کو پہچانیں اور اپنے درمیان موجود مخلص مگر خاموشی سے کام کرنے والے عناصر کو پہچانیں۔ مسلمانوں کا مستقبل انشاءاللہ آج بھی روشن ہے۔ ہندستان کے کروروں مسلمانوں کو دنیا کی کوئی طاقت اپنے جائز حقوق حاصل کرنے اور آگے آنے سے نہیں روک سکتی۔ جس دن مسلمان خوف و دہشت کو تیاگ کر صرف اور صرف اپنے ایمان پر اعتقاد کرتے ہوئے سامنے آئیں گے انھیں زندگی کے کسی بھی میدان میں آگے بڑھنے سے نہیں روکا جاسکے گا (ہفت روزہ نئی دنیا ۹ - ۱۵ نومبر ۱۹۹۰)

اوپر جو "اقتباس" نقل کیا گیا، وہ کوئی منفرد تحریر نہیں۔ آجکل اس قسم کے مضامین کثرت سے اخبارات و رسائل میں شائع ہو رہے ہیں (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، مفصل خط مطبوعہ قومی آواز، ۷ نومبر ۱۹۹۰)

مسلمان جو پچھلے برسوں میں نام نہاد لیڈروں کے لفظی بیانات اور جوشیلی تقریروں سے وقتی طور پر انھیں اپنا رہنما سمجھ بیٹھے تھے، وہ اب ان کی نااہلیت کو بخوبی طور پر جان چکے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۰ کے واقعات نے آخری طور پر ان کی حقیقت کھول دی ہے۔ اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ یہ لوگ مسائل کی نوعیت کو جانتے بھی نہیں، کجا کہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ ان میں رہنمائی دیں گے۔ ان نام نہاد لیڈروں نے قرآن کے مطابق، اس کام کا کریڈٹ لینا چاہا تھا جس کو انھوں نے کیا نہیں (آل عمران ۱۸۸) اللہ نے دکھا دیا کہ ایسا کریڈٹ کسی کو اس دنیا میں نہیں ملتا۔

مسلمان اب ان نااہل رہنماؤں کے فریب سے باہر آچکے ہیں، اور خود یہ واقعہ مسلمانوں کے لئے روشن مستقبل کی یقینی ضمانت ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کے اصل ذمہ دار خود ان کے نام نہاد رہنما ہیں۔ مسلمانوں کا ان رہنماؤں کی حقیقت کو جان لینا ان کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ مسلمانوں کی اس دریافت کے بعد اب کی تعمیر نو کا سفر شروع ہوچکا ہے، اور جو سفر صحیح سمت میں شروع ہو، وہ آخرکار اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔

اردو

- تذکیر القرآن جلد اول
- تذکیر القرآن جلد دوم
- اللہ اکبر
- پیغمبر انقلاب
- مذہب اور جدید چیلنج
- عظمت قرآن
- عظمت اسلام
- عظمت صحابہ
- دین کامل
- الاسلام
- ظہور اسلام
- اسلامی زندگی
- احیاء اسلام
- راز حیات
- صراط مستقیم
- خاتون اسلام
- سوشلزم اور اسلام
- اسلام اور عصر حاضر
- الربانیہ
- کاروان ملت
- حقیقت حج
- اسلامی تعلیمات
- اسلام دور جدید کا خالق
- حدیث رسولؐ
- ڈائری جلد اول
- ڈائری جلد دوم
- سفرنامہ (ملکی اسفار)
- سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)
- میوات کا سفر
- قیادت نامہ
- راہ عمل
- تعبیر کی غلطی
- دین کی سیاسی تعبیر
- اقوال حکمت
- انوار حکمت
- تعمیر کی طرف
- تبلیغی تحریک
- تجدید دین
- عقلیات اسلام
- مذہب اور سائنس
- قرآن کا مطلوب انسان
- دین کیا ہے
- اسلام دین فطرت
- تعمیر ملت
- تاریخ کا سبق
- فسادات کا مسئلہ
- انسان اپنے آپ کو پہچان
- تعارف اسلام
- اسلام پندرھویں صدی میں
- راہیں بند نہیں
- ایمانی طاقت
- اتحاد ملت
- سبق آموز واقعات
- زلزلۂ قیامت
- حقیقت کی تلاش
- پیغمبر اسلام
- آخری سفر
- اسلامی دعوت
- خدا اور انسان
- حل یہاں ہے
- سچا راستہ
- دینی تعلیم
- حیات طیبہ
- باغ جنت
- نار جہنم
- خلیج ڈائری
- رہ یات
- شخصیات اسلام
- تعدد ازواج
- روشن مستقبل
- صوم رمضان
- علم کلام
- صداقت اسلام
- علماء اور دور جدید
- ہندستانی مسلمان
- سیرت رسولؐ

عربی

- الاسلام یتحدی
- سقوط الماركسية
- حقيقة الحج

آڈیو کیسٹ

- A-1 حقیقت ایمان
- A-2 حقیقت نماز
- A-3 حقیقت روزہ
- A-4 حقیقت زکوٰۃ
- A-5 حقیقت حج
- A-6 سنت رسولؐ
- A-7 میدان عمل
- A-8 پیغمبرانہ رہنمائی
- A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات
- A-10 اسلامی اخلاق
- A-11 اتحاد ملت
- A-12 تعمیر ملت
- A-13 نصیحت لقمان

ویڈیو کیسٹ

- V-1 پیغمبر انقلاب
- V-2 اسلام داعی امن
- V-3 اسلام دور جدید کا خالق
- V-4 امت مسلمہ کے لیے نئے چیلنج
- V-5 اسلام اور سماجی انصاف
- V-6 اسلام اور دور حاضر

- God Arises
- Muhammad The Prophet of Revolution
- Islam As It Is
- God Oriented Life
- Words of the Prophet
- Introducing Islam
- Religion and Science
- Tabligh Movement
- Islam the Voice of Human Nature
- Islam the Creator of Modern Age
- The Way to Find God
- The Teachings of Islam
- The Good Life
- The Garden of Paradise
- The Fire of Hell
- Man Know Thyself!
- Muhammad The Ideal Character
- Social Justice in Islam
- Polygamy in Islam
- Words of Wisdom

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1976-77
1978
1979
1980
1981
1982
1983
1984
1985
1986
1987
1988
1989
1990
1991

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984
1985
1986
1987
1988
1989
1990
1991

فائل الرسالہ ھندی (مجلد)

1990-91